عکسِ جاوید

منظوم اردو ترجمہ

جاوید نامہ

مع حواشی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

عکسِ جاوید

منظوم ترجمہ

جاوید نامہ مع مقدمہ و حواشی

ظہیر احمد صدیقی

بزمِ اقبال ۔ لاہور

عکسِ جاوید

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تاریخ اشاعت ..... جنوری ۱۹۹۳ء

ناشر ..... ڈاکٹر وحید قریشی

معتمد اعزازی "بزم اقبال"

مطبع : ..... ظفر سنز پرنٹرز
۵۵-بی شمع پلازہ ۲، فیروزپور روڈ
لاہور

تعداد : ۵۰۰

صفحات : ۳۰۴

قیمت ۱/- روپے

عرضِ ناشر

جاوید نامہ علامہ اقبال کے شعری مجموعوں میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مشکل کتاب ہے جس کی تفہیم کے لیے کئی شرحیں اور تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ یہ منظوم ترجمہ بھی اس لحاظ سے اہم ہے کہ ظہیر احمد صدیقی اُردو اور فارسی شاعری پہ یکساں قدرت رکھتے ہیں اور کتاب کے اصل متن کے مطالب کو انہوں نے کہیں اوجھل نہیں ہونے دیا۔ علاوہ ازیں مفصل حواشی لکھ کر انہوں نے مشکل مقامات کو پڑھنے والوں کے لیے آسان ہی نہیں کیا بلکہ اقبالیات کے شائقین کے لیے تفہیم اقبال کی راہ ہموار کر دی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی

فہرستِ مطالب

- مقدمہ
- متن جاوید نامہ
  (جاوید نامہ کا اردو میں منظوم ترجمہ)
- تعلیقات و توضیحات

مقدّمہ

مقدّمہ

جاوید نامہ فارسی زبان میں علامہ اقبال کی زندۂ جاوید تصنیف ہے۔ یہ کتاب ان کا شعری شاہکار ہی نہیں بلکہ ان کے افکار کا بھی حسین ترین مرقع ہے جس میں وہ اپنی سیاحتِ عالمِ علوی یعنی خیالی معراج کے ضمن میں زندگی، انسان، کائنات اور خدا کے بارہ میں اپنے افکار اور حقایق و معارف بیان فرماتے ہیں۔

جاوید نامہ کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے۔ شاعر تجلیِ ذات کے مشاہدے کی آرزو کرتا ہے۔ اچانک روحِ رومی ایک پہاڑی کے عقب سے نمودار ہوتی ہے اور مسئلۂ زمان و مکان اور فلسفۂ معراج پر روشنی ڈالتی ہے۔ ناگہاں زروان جو زمان و مکان کا فرشتہ ہے جس کے دو چہرے ہیں ایک تاریک اور دوسرا روشن، نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم ذرا سے لی مع اللہ پڑھو تو مجھ سے یعنی زمان و مکان کی بندشوں سے آزادی حاصل کر سکتے ہو پھر ایک دم عالم رنگ و بو غائب ہو جاتا ہے اور ایک جہانِ ہاؤ ہُو سامنے آتا ہے۔ فرشتے زمزمہ سنجی کرتے ہوئے شاعر کا استقبال کرتے ہیں۔ شاعر مرشدِ رومی کی رہنمائی میں آسمانی سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ دونوں مسافر چاند، عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ اور زحل سیاروں کی سیر کرتے ہیں۔ وہاں مشاہیر کی ارواح سے مل کر مسائلِ حیات پر بحث کرتے ہیں۔ انسان، کائنات، خدا، زمان و مکان،

تقدیر و توکل، دین و وطن، اشتراکیت و سرمایہ داری، ملوکیت و جمہوریت، معیشت و معاشرت؛ غرض زندگی سے متعلق ہر بنیادی مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے اور ایسے دقیق و لطیف حقایق و معارف اور حکیمانہ نکتے بیان کیے جاتے ہیں جو زندگی آموز بھی ہیں، زندگی آمیز بھی اور دلنشیں بھی۔ درحقیقت جاوید نامہ حسنِ تخیل، حسنِ ترتیب، حسنِ بیاں اور منفعتِ انسانی کے اعتبار سے علامہ اقبال کی سب سے بلند پایہ تصنیف ہے۔ بقول جناب مولوی عبدالحق:

"جاوید نامہ صرف شاعری ہی کی نہیں بلکہ فکر و نظر کی بھی معراج ہے"۔[1]

جاوید نامہ علامہ نے ۱۹۲۹ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ بقول جناب سید عبدالواحد[2] یہ کتاب شائع ہوتے ہی کلاسیکی کتابوں میں شمار ہونے لگی۔ ان کے خیال میں جاوید نامہ دنیا کی مشہور کلاسیکی شاہکار ہومر کی "الیڈ"، کالیداس کی "شکنتلا"، شیکسپیئر کی "ہیملٹ"، ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" اور گوئٹے کی "فاؤسٹ" کے ہم پایہ ہے اور بقول علامہ اسلم جیراجپوری[3] جاوید نامہ، شاہنامۂ فردوسی، مثنوی رومی، گلستانِ سعدی، دیوانِ حافظ کے ہم پلہ ہی نہیں بلکہ معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے اُن پر فوقیت رکھتی ہے۔ موصوف جاوید نامہ کی فنی و فکری عظمت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ۱۹۳۲ میں نیرنگِ خیال کے اقبال نمبر میں "زندہ رود" (جاوید نامہ میں علامہ اقبال کا نام) کی مدح میں فارسی زبان میں ایک قصیدہ لکھا جس میں "وانمودی منزلِ مقصود را" اور "شاعری در ذاتِ تُو معراج یافت" کہہ کر علامہ کے فکر و فن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

بقول جناب چوہدری محمد حسین "حضرت علامہ کا معراجِ رسولؐ پر ایک کتاب لکھنے کا ایک مدت سے ارادہ تھا جس میں وہ معراجِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعبیر و تفسیر علومِ جدیدہ اور عصری تقاضوں کی روشنی میں کرنا چاہتے تھے کہ اسی اثنا میں اٹلی کے ایک مشہور شاعر دانتے Dante کی

---

[1] Islam and the Divine Comedy

By Miguel Asin

کتاب طربیۂ خداوندی The Divine Comedy پر یورپ میں نئی اور اہم تنقیدات اور تحقیقات شائع ہوئیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ "طربیۂ خداوندی" بہت حد تک معراجِ رسولؐ کے واقعہ اور اس سے متعلق روایات و ادبیات ہی پر مبنی ہے۔ اس بات سے علامہ اقبال کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ دانتے کے انداز میں ادبی نقطۂ نگاہ سے "معراجِ اقبال" لکھی جائے تاکہ فکر و تخیل کی پرواز کو لامحدود فضائیں میسر آسکیں۔

علامہ اقبال اس سے پہلے گلشن راز محمود شبستری ——— کے جواب میں گلشنِ رازِ جدید اور گوئٹے ——— کے دیوانِ مغرب کے جواب میں پیامِ مشرق لکھ چکے تھے لیکن جس طرح یہ کتابیں 'جواب آں غزل' کے طور پر نہیں بلکہ موضوع کے لحاظ سے جواب تھا، اسی طرح "جاوید نامہ" بھی "طربیۂ خداوندی" کا موضوع کے لحاظ ہی سے جواب ہے۔[۴]

معراجِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیر معمولی اور مہتم بالشان واقعہ کا اثر علامہ کے دل و دماغ پر بہت گہرا تھا۔ معراجِ رسولؐ نے انسان کو ارتقائے لامحدود اور زمان و مکان کی تسخیر کا جو پیغام دیا ہے وہ ان کے جذبۂ شوق اور فکرِ رسا کے لیے ایک مہمیز بنا۔ معراج کے موضوع پر جاوید نامہ کی مستقل تصنیف کے علاوہ علامہ کے کلام میں جا بجا اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج
ناوک ہے مسلماں ہدف اس کا ہے ثریا
ہے سرِّ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج

یا

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردوں

عام خیال ہے کہ معراجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم الشان روایت سے پہلے بھی معراج

یا سیاحتِ عالمِ علوی کی کچھ معمولی سی روایات موجود تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت قرآنِ پاک میں مذکور ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ

والارض : ۶-۲۶

"اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ کو زمین اور آسمان کی بادشاہی دکھائی"۔

اسرائیلی پیغمبروں اور نبیوں کے بارہ میں بھی روایات ہیں کہ انہیں مکاشفے کے ذریعے آسمانی حقایق کا مشاہدہ کرایا گیا یا انہیں جنّت و دوزخ کے مناظر دکھائے گئے۔ زرتشت کے مشاہدۂ ربانی کا ذکر بھی ان کی مذہبی کتابوں میں ملتا ہے۔ قدیم ایران میں ارداویراف کی سیاحت عالمِ علوی کسی حد تک تفصیلی بھی ہے اور دلچسپ بھی جو مختصراً یوں ہے کہ :

"ایک روز زرتشتی مذہب کے علماء اور موبد آتشکدۂ آذر فرنبغ میں جمع ہوتے اور فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی مُوبد عالمِ بالا میں جاکر خبر لاوے کہ ہماری دعائیں اور عبادات اہورامزدا یعنی اللہ کے پاس پہنچتی ہیں کہ نہیں۔ پہلے سات آدمیوں کو منتخب کیا جاتا ہے جو گفتارِ نیک، کردارِ نیک اور خیالِ نیک کی خوبیوں سے بدرجۂ اتم آراستہ تھے۔ ان سات بزرگ ہستیوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے میں سب سے زیادہ نیک شخص کا سیاحتِ عالمِ علوی کے لیے انتخاب کریں۔ یہ لوگ پہلے تین افراد چنتے ہیں اور پھر یہ تین اپنے میں سب سے زیادہ مقدس ہستی کو منتخب کرتے ہیں جس کا نام ویراف تھا۔ ویراف کی سات بہنیں تھیں جو اس کی بیویاں بھی تھیں۔ یہ ساتوں بہنیں فریاد کرتی ہیں کہ ہمارے اکلوتے بھائی اور اکلوتے خاوند کو مُردوں کی دنیا میں بھیج کر ہم پر سراسر ظلم کیا جارہا ہے اور احتجاج کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ وہ گھر جس کی ساتوں کڑیاں ایک شہتیر پر رکھی ہوئی ہیں اور تم

اس شہتیر کو کھسکا رہے ہو، تباہ نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ اہلِ مجلس کے تسلی دینے پر وہ مطمئن ہو جاتی ہیں۔ ایک مقدس جگہ پہ ارداویراف نہا دھو کر صاف ستھرے اور معطر کپڑے پہن کر آراستہ پیراستہ تخت پر بیٹھ جاتا ہے زرتشتی مذہب کے علماء شراب اور منگ گشتاسپی کے تین جام ایک گفتارِ نیک، ایک کردارِ نیک اور ایک خیالِ نیک کے نام پہ پُر کر کے ارداویراف کو دیتے ہیں جن کو پی کر وہ سو جاتا ہے۔ سات دن تک ساتوں بہنیں اور علماء زرتشتی دعا و درود اور مذہبی نغمے دن رات ارداویراف کے قریب بیٹھے پڑھتے اور گاتے رہتے ہیں۔ آخر ساتویں روز اسے ہوش آتا ہے اور وہ سفرِ آسمانی کی تفصیلات بتاتا ہے کہ اس کی روح اس کے جسم سے علیحدہ ہو کر دایتیک (ایک پہاڑ ہے جہاں سے پل صراط شروع ہوتا ہے) پر پہنچتی ہے اور وہاں سے سفرِ آسمانی پر روانہ ہوتی ہے۔ اس سفرِ آسمانی میں دو فرشتے اہرو اور آذر اس کے راہنما ہوتے ہیں۔ جنت و دوزخ کی سیر کراتے ہیں۔ جنت و دوزخ کی سیر کے واقعات و مشاہدات عام طور پر نیک اعمال کی جزا اور اعمالِ بد کی سزا سے متعلق ہیں۔ مثلاً دوزخ میں ایک آدمی کی روح نظر آتی ہے کہ جس کے جسم کا گوشت لوہے کی کنگھی سے چھیل کر اسے کھانے کو دیا جا رہا ہے۔ ارداویراف پوچھتا ہے کہ یہ کون بدبخت ہے اور اس کا گناہ کیا ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جو دنیا میں لوگوں سے جھوٹے وعدے کیا کرتا تھا۔

جنت و دوزخ کی سیر سے فارغ ہو کر اہرو اور آذر فرشتے ارداویراف کو عالمِ ملکوت اور نورِ ازلی یعنی اہورامزدا کے حضور میں لے جاتے ہیں۔ ایک آواز اسے خطاب کرتی ہے۔ بولنے والا نظر نہیں آتا۔ ہر سمت نور ہی نور ہے۔ ارداویراف حیران رہ جاتا ہے۔ آخر سمجھ جاتا ہے کہ یہی اہورامزدا ہے۔ اہورامزدا اہلِ جہاں کو

چند نصیحتیں کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے: "این نیز آگاہ بوید کہ غبار بُد وگاہ غبار بود۔ اسپ غبار بود زر و سیم و غبار بود تن مردماں، آں کس بہ غبار نیا میزد کہ اندر گیتی اہردی ستاید و کارِ ثواب کند" (یاد رکھو مٹی ہی مٹی میں ملتی ہے۔ گھوڑا، چاندی، سونا مٹی ہیں اور جسمِ انسانی بھی مٹی ہے۔ وہ آدمی مٹی میں نہیں ملتا جو دنیا میں تقویٰ اختیار کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے)۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ ارداویراف کی طرح دانتے الیغری بھی سات دن تک آسمانی سیر کرتا ہے۔ ابنِ عربی، دانتے اور علامہ اقبالؒ اپنی سیاحت عالمِ علوی پہاڑ ہی پر سے شروع کرتے ہیں اور تینوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی راہنما ہے۔ جاوید نامہ کے اختتام میں ندائے جمال کا یہ مضمون کہ:

هر کہ گنجد اندرو میرد درو بودہ اندر جہانِ چارسُو
(جو سمائے اس میں مرتا ہے وہیں) (ہے جہانِ چارسُو میں تو مکیں)
چارسُو را غرق اندر خویش کُن زندگی خواہی خودی را پیش کن
(چارسُو کو اپنے اندر غرق کر) (خود کو پالے زندگی چاہے اگر)

ارداویراف کی سیاحتِ عالمِ علوی کے اختتام میں ندائے غیبی ... اس مضمون سے بہت حد تک مشابہت رکھتا ہے: "یاد رکھو مٹی ہی مٹی میں ملتی ہے۔ گھوڑا، چاندی، سونا مٹی ہیں — جسمِ انسانی بھی مٹی ہے۔ وہ آدمی مٹی میں نہیں ملتا جو دنیا میں تقویٰ اختیار کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے"۔

ارداویراف نامہ و معراجِ حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

اسلام سے قبل سفرِ آسمانی کی جتنی روایات ہیں اوّل تو وہ مبہم اشارے سے ہیں۔ دوم تاریخی حقیقت نہیں صرف روایتی قصے ہیں۔ سوم صرف مکاشفے یا خواب ہیں جن کی حضرت رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراجِ جسمانی سے کوئی مماثلت نہیں۔ ارداویراف کا سفرِ آسمانی قدرے مفصل ہے،

اور واقعات میں معراجِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے قدرے مشابہت بھی رکھتا ہے لیکن یہ بھی درحقیقت ایک خواب سا ہے جیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ دیراف منگ شراب کے پیالے پی کر مدہوش ہو جاتا ہے اور سو جاتا ہے۔ اس مدہوشی یا خواب میں وہ سیرِ آسمانی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل حقایق کی روشنی میں ارداویراف کے آسمانی سفر کی کہانی رسولِ پاک صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی معراجِ جسمانی کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ غالباً یہ تدلیسی کارنامہ کسی متعصب غیر مسلم ایرانی کے شاطرانہ ذہن کا فنکارانہ مظاہرہ ہے۔

۱۔ ہندی اور ایرانی غیر مسلم یا غیر معتبر متعصب ذہن نے ایسی بہت سی تدلیسات انجام دی ہیں۔ علمائے اسلام کی مذہبی اور ادبی کتابوں میں اپنے مطلب کی عبارات کا اضافہ یا کتابیں لکھ کر ان کے نام سے منسوب کرنا اکثر ہوا ہے جیسے منصور حلاج کا فارسی غزلیات کا دیوان جو حال ہی میں ایران سے شائع ہوا ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں فارسی غزل کا آغاز بھی صحیح معنوں میں نہیں ہوا تھا۔

۲۔ ارداویراف نامہ بقول ڈکٹر دبیری نژاد پہلی تین ہجری صدیوں کی تالیف ہے (ہنرو مردم ص ۸۲ شمارہ ۱۸۳)۔ اگرچہ موصوف نے اس سے نتائج برعکس اخذ کیے ہیں۔

۳۔ قدیم ایران کے ادب میں ارداویراف کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ ادب نامۂ ایران میں جناب مقبول بیگ بدخشانی نے قدیم ایران کی ایک سو ایک تصانیف کا ذکر کیا ہے لیکن ارداویراف نامہ کا ذکر نہیں ـــــ کرستن سین نے بھی اپنی کتاب "ایران در زمانِ ساسانیاں" میں اس کتاب یا اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا۔

۴۔ ارداویراف کو سفرِ آسمانی پر اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ ایرانی تہذیب و معاشرت، سخت ترین حالات سے دوچار ہے تاکہ اہورامزدا مدد کرے۔ ظاہر ہے یہ حالات

اسلام سے پہلے نہیں ہو سکتے تھے۔ اسلام کی روشنی کے بعد ہی قدیم ایرانی تہذیب و تمدن کی تاریکیاں زوال پذیر ہوئیں۔

۵۔ ارداویراف نامہ مسلمانوں کے تعصب نے مٹا دی ہو تو ایسا بھی قرینِ قیاس نہیں یعنی اصل کتاب تو مسلمانوں نے تعصب میں جلا ڈالی یا ضائع کر دی صرف نام باقی رہ گیا۔ بعد میں تیسری صدی ہجری میں لوگوں کی روایات کے مطابق اس کتاب کو مدوّن کرنا پڑا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے۔ مسلمانوں نے اوستا کو، جو مذہبِ زرتشتی کی مقدس ترین کتاب تھی، نقصان نہیں پہنچایا تو اس کتاب ارداویراف نامہ کو کیا نقصان پہنچاتے۔

معراجِ حضرتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

معراجِ رسولؐ کا واقعہ حقیقی بھی ہے وسیع اور مکمل بھی اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور خیال افروز بھی۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کی تہذیب، ادبیات اور سیاست پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ دوسری اقوام بالخصوص اقوامِ مغرب پر بھی معراجِ رسولؐ کی روایت اثر انداز ہوئی ہے۔ معراج کا تصور اسلامی طرزِ حیات کا بنیادی تصور ہے اور اعلیٰ ترین روحانی مدارج تک رسائی یعنی معراجِ روحانی ہر مومن کا مطمحِ نظر سمجھا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن

"نماز مومنوں کے لیے معراج ہے!"

معراج عروج سے مشتق ہے جس کے معنی چڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چونکہ شبِ معراج میں سیرِ افلاک اور سدرۃ المنتہیٰ اور اس سے بھی آگے جلوۂ خداوندی کا مشاہدہ فرمایا، ان مشاہدات اور واقعات کے ذکر میں زبان وحی ترجمان نے "عُرِجَ بِی" کا جملہ استعمال فرمایا۔ اس لیے اس مہتم بالشان واقعہ کو معراج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

معراج کا غیر معمولی واقعہ، ہجرتِ رسولؐ سے تقریباً ایک سال قبل ۲۷۔ رجب کو پیش آیا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن پاک کی سورہ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم کی ابتدائی آیات میں موجود ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں مکہ (مسجدِ حرام) سے بیت المقدس (مسجدِ اقصیٰ) تک سیر کا تذکرہ ہے جسے اسریٰ کہتے ہیں۔ اسرا کے معنی شب میں لے جانے کے ہیں اور سورہ نجم میں ملاءِ اعلیٰ کی سیر و عروج کا ذکر ہے۔ اسے معراج کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات کے بارہ میں بہت سی احادیث و روایات ہیں۔

روایات میں مذکور ہے کہ معراج کی رات کو سب سے پہلے جبریلؑ نے آپؐ کا سینہ چاک کیا۔ قلبِ اطہر کو زمزم کے پانی سے دھویا اور اسے ایمان و حکمت سے بھر دیا۔ پھر آپؐ حضرت جبریلؑ کے ہمراہ براق پر سوار ہو کر جو برق سے زیادہ تیز رفتار اور نظر سے زیادہ سبک خرام تھا، بیت المقدس پہنچے۔ وہاں آپؐ نے دو رکعت نماز ادا کی اور جبریلِ امیںؑ نے آپؐ کو ایک دودھ کا اور ایک شراب کا پیالہ پیش کیا۔ آپؐ نے دودھ کا پیالہ قبول فرمایا۔ پھر آپؐ حضرت جبریلؑ کی معیت میں ملاءِ اعلیٰ کی جانب روانہ ہوئے۔

پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ نے آپؐ کو خوش آمدید کہا۔ اسی طرح دوسرے آسمانوں پر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام نے آپؐ کا خیر مقدم کیا۔ ساتویں یعنی آخری آسمان پر جناب ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے آپؐ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے جو ایک بیری کا درخت ہے اور جسے محدثین نے ایمان و حکمت کی تمثیل قرار دیا ہے۔ قرآن میں میں کلمۃً طیبہ یعنی ایمان کو شجرِ طیبہ کہا گیا ہے ــــ (کَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ۔ ابراہیم ۲۴/۱۴)۔

سدرۃ المنتہیٰ پر لاتعداد ملائکہ جگنو کی طرح چمک رہے تھے۔ جبریلِ امینؑ نے صرف یہیں تک آپؐ کا ساتھ دیا۔ پھر آپؐ تنہا قاب قوسین کے قربِ خاص اور خطابِ خداوندی سے سرفراز ہوئے۔ جس کا ذکر سورۃ النجم میں ہے۔ واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت فرمایا کہ معراج کا کیا تحفہ لائے ہو؟ آپؐ نے فرمایا "پچاس نمازیں!" ــــ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا یہ بارِ گراں امت برداشت

نہ کر سکے گی۔ چنانچہ ان کے کہنے پر تخفیف کی درخواست کے لیے آپؐ چند بار حضورِ خداوندی میں تشریف لے گئے حتیٰ کہ صرف پانچ نمازیں رہ گئیں۔ مزید کمی کے لیے آپؐ نے اصرار فرمانا مناسب نہ جانا اور فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ خداوندِ قدوس نے اس تسلیم و رضا سے خوش ہو کر اپنا خاص کرم فرمایا اور پانچ نمازوں کا ثواب پچاس کے برابر کر دیا۔

روایات میں آپؐ کے جنت و جہنم کے مشاہدے کی تفصیلات بھی ہیں۔ معراج کے تمام واقعات اور مشاہدات اتنے تھوڑے وقفے میں انجام پا گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واپسی پر دروازے کی زنجیر بدستور ہل رہی تھی اور آپؐ کے بستر کی گرمی ابھی تک باقی تھی۔ گویا ایک پلک جھپکنے میں ہی مکان و لامکاں کے تمام مراحل طے ہو گئے۔

واقعۂ معراج کے راوی ۲۲ جلیل القدر صحابیؓ ہیں جن میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت ابنِ عمرؓ جیسے بزرگ ترین صحابیؓ شامل ہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت امِ ہانیؓ، حضرت امِ سلمہؓ اس عظیم الشان واقعے کو روایت فرماتی ہیں (رک ص ۶۲ تا ۱۱۸ نشر الطیب فی ذکر الحبیب از مولانا اشرف علی صاحب تھانوی)۔

تاثرات معراجِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

معراجِ رسولؐ کے واقعہ نے اسلام کی تمدنی اور تخیلی تاریخ میں دور رس، ہمہ گیر اور گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ معراجِ نبویؐ کا عقیدہ ہر مسلمان کے دل میں اس طرح گھر کر چکا ہے کہ اس کا صحیح تسلیم کرنا ہر مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔

اسلامی ادبیات میں معراج کی روایت کے اثرات گہرے بھی ہیں اور وسیع بھی۔ تقریباً ہر بڑے مسلمان مصنف نے معراجِ نبویؐ کے اسرار و معارف پہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک زمانے میں یہ روایت عام تھی کہ شعراء اپنی مثنویوں میں نعتِ پیغمبرؐ کے بعد معراجِ رسولؐ پر ایک علیحدہ مستقل باب لکھتے تھے۔ نظامی اور جامی نے تقریباً اپنی تمام مثنویوں میں معراجِ رسولؐ پر نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ دنیا کی تقریباً ہر

اس زبان میں، جو مسلمان بولتے ہیں، معراج نامے موجود ہیں جن میں معراجِ رسولِ پاکؐ کے واقعات کو نظم یا نثر میں بیان کیا گیا ہے۔

کچھ مفکرین اور صوفیا نے بھی تجلیِ ذات کے بارہ میں اپنے مکاشفات اور مشاہدات کا ذکر کیا ہے اور ان مکاشفات و مشاہدات کو استعاری طور پر معراج ہی کا نام دیا ہے۔ صوفیائے کرام میں محی الدین ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ بہت مشہور ہے جس میں انہوں نے ذاتی خیالی معراج کی کیفیت بیان کی ہے۔ اس سیاحت عالمِ علوی میں انہوں نے دو افراد کو اپنا راہنما بنایا ہے جن میں ایک فلسفی ہے اور دوسرا عالمِ دین۔ معراجِ نبویؐ کے انداز میں تمام مناظر، واقعات اور مشاہدات کا ذکر ہے۔ مذہبی مسائل پر تفصیلی بحث ہے اور خاص طور پر مرنے کے بعد زندگی سے متعلق واقعات پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ ابنِ عربی کی معراج کی حیثیت فنی، ادبی کم اور مذہبی زیادہ ہے۔

مسلم متصوفین میں سب سے پہلے حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنی خیالی یا مکاشفاتی معراج کی کیفیت بیان کی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے: الف

"جب خدا نے مجھے تمام موجودات سے بے نیاز کر کے اپنے نور سے منور فرمایا اور تمام اسرار و رموز سے آگاہی عطا کی تو میں نے چشمِ یقیں سے خدا تعالےٰ کا مشاہدہ کیا اور جب خدا نے میری ہستی کو فنا کر کے بقا کا مقام عطا کیا، تو اپنی خودی کا میں نے بے حجابانہ مشاہدہ کیا۔ گویا میں نے اللہ کو اللہ کے ذریعے سے دیکھا اور اس کی حقیقت میں گم ہو کر گونگا، بہرا اور جاہل ہو گیا اور نفسِ امارہ کو فنا کر کے ایک عرصہ وہاں قیام کیا۔ پھر خدا نے مجھ کو علومِ ازلی سے آگاہ فرما کر زبان کو اپنے کرم سے گویائی اور آنکھوں کو اپنے نور سے بصیرت عطا کی جس کے ذریعے سے ہر شے میں ذاتِ حق کو جلوہ گر پایا اور ذاتِ حق کے

الف: حضرت خواجہ معین الدین سنجری نے بھی بحر الحقایق میں اپنی مکاشفاتی معراج بیان کی ہے۔

علم سے علم حاصل کیا۔ اللہ تعالےٰ نے تاجِ کرامت میرے سر پر رکھا اور کہا کہ میری مخلوق کے سامنے پیش ہو۔ میں تیس سال تک وحدانیت کی فضا میں پرواز کرتا رہا اور تیس سال فضائے الوہیت میں اڑتا رہا اور تیس سال میں نے فضائے یکتائیت میں پرواز کی ـــــ پھر چار ہزار مراتب طے کرنے کے بعد ولایت کے اعلیٰ ترین مرتبہ تک پہنچ گیا اور جب خود کو نبوت کے ابتدائی درجے میں، میں نے یہ خیال آیا کہ شاید اتنا عظیم مرتبہ کسی کو حاصل نہ ہوا ہو لیکن جب غور کیا تو معلوم ہوا میرا سر ایک نبی کے قدموں کے نیچے ہے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا ہوا کرتی ہے لیکن نبوت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس مقام سے جب میری روح فردوس و جہنم اور ملائکہ کے مساجد سے کے لیے روانہ ہوئی تو وہاں انبیاء کرام سے شرفِ نیاز حاصل ہوا اور میں نے سب کو سلام کیا لیکن جب میری روح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روبرو پہنچی تو دیکھا کہ لاکھوں آگ کے دریاؤں میں سے گذر کر وہاں پہنچا جا سکتا ہے اور نور کے ہزاروں حجابات درمیان میں حائل ہیں۔ اگر ایک قدم بھی آگے بڑھاتا تو فنا ہو جاتا۔ میں ہیبت و وحشت سے ایسا مدہوش ہوا کہ مجھے اپنی کچھ خبر نہ رہی۔ ہر چند میں نے کوشش کی کہ رسولِ پاکؐ کے خیمے کی طناب کی میخ ہی دیکھ لوں، ہمت نہ ہو سکی ـــــ یوں مجھے قربِ حق تو حاصل ہو گیا لیکن اس کے محبوب تک رسائی نہ مل سکی۔ اللہ تعالےٰ تو ہر بندے کے ہمراہ اور قریب ہے اور ہر بندہ اپنی استطاعت کے مطابق مشاہدۂ حق کر سکتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حرمِ خاص میں ہیں۔ ان کی زیارت اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب لا الٰہ الا اللہ کی منزل سے سالک گذر جائے۔ اللہ اور اس کے محبوبؐ کی راہیں تو ایک ہی ہیں لیکن

زیارتِ محبوبِ خدا کے لیے تابِ نظارہ کی ضرورت ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اپنی خودی کو کیسے مٹاؤں؟ ــــ جواب ملا۔ یہ مقام صرف ہمارے دوست محمدِ عربی کی متابعت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کی خاکِ پا کو اپنی آنکھوں کا سُرمہ بنالو اور ہمیشہ اس کی پیروی کرو[9] ــــ (یہاں پر ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ علامہ اقبال اپنی معراج کے آخر میں فرماتے ہیں کہ پیغامِ خداوندی انسانوں کے لیے یہ ہے کہ ؎

زندگی خواہی خودی را پیش کن
چار سُو را غرقِ اندر خویش کن

یہ فرق ہے ایک صوفی میں اور علامہ اقبال میں!)"

سیر العباد الی المعاد

ابوالمجد مجدود حسن بن آدم سنائی غزنوی المعروف بہ حکیم سنائی؛ ولادت در حدود ۴۵۰ یا ۴۷۰ وفات ۵۲۵ یا ۵۷۶ کی سیر العباد الی المعاد میں بھی ایک خیالی آسمانی سفر کا تصور موجود ہے شاعر نے اس خیالی سفر کے ذریعے متکلمانہ اور متصوفانہ مطالب کی توضیح و تعبیر پیش کی ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

"شاعر کتاب کے آغاز میں انسانی وجود کی ابتدا کا متکلمانہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ انسان کا ارتقا جمادات و نباتات و حیوانات کے مختلف مراتب سے گذر کر ہوا ہے جیسے رومی نے اپنی مثنوی میں، نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ کے دیباچہ میں، ابنِ مسکویہ کے تتبع میں بالتفصیل پیش کیا ہے جب شاعر یعنی انسان حیوانیت کے درجے پر ہوتا ہے تو اسے ایک پیرِ کامل اور راہنما مل جاتا ہے۔ یہ پیرِ کامل عقلِ مستفاد ہے جس کے ذریعے سے شاعر مختلف عناصر کی سیر کرتا ہوا فلکِ قمر، فلکِ مشتری، فلکِ مریخ اور فلکِ

خورشید پر پہنچتا ہے ـــــ اس سفر میں شاعر نے عناصرِ اربعہ کو مختلف انسانی رذایل کا سرچشمہ تصور کرتے ہوئے ہر رذیلتِ نفس کو تجسیم کر کے بیان کیا ہے۔ کسی رذیلت کو سانپ، کسی کو بچھو، کسی کو سؤر اور کسی کو عفریتِ ہیبت ناک کی شکل میں پیش کیا ہے۔

شاعر کو ایک پیرِ کامل، جسے وہ "پیر مردی لطیف و نورانی" کہتا ہے (یعنی عقلِ مستفاد) سفر پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم نباتات سے فرشتے بن سکتے ہو اور زمین سے آسمان پر پہنچ سکتے ہو، بشرطیکہ تم کسی دانائے راہ کو راہنما بناؤ اور اپنی قوتِ بہیمیت کو پوری طرح دبا دو ؎

از نباتی ملک توانی شد
از زمیں بر فلک توانی شد

اگر تمہاری رائے ہو اور تم چلنے کو تیار ہو تو میں تمہارا یار و یاور بن سکتا ہوں ؎

یار باشم چوں رای داری تو
دست گیرم چوں پای داری تو[1]

سو شاعر اس پیرِ مرد یعنی عقلِ مستفاد کی رہنمائی میں سفر شروع کرتا ہے۔ عقلِ مستفاد گویا شاعر کی آنکھ بن جاتی ہے اور خود شاعر عقلِ مستفاد کے پاؤں بن جاتا ہے۔ سفر میں سب سے پہلے ایک تودۂ خاک پر گذر ہوتا ہے اس خاکدان کی فضا بہت ہی ناخوش گوار ہے۔ اس کے ایک حصے میں آگ اور ایک حصے میں پانی ہے اور ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ یہاں بھیڑیے اور کتے غول کے غول پھر رہے ہیں۔ یہاں بلی، چوہے، سؤر، سانپ اور بچھو بہتات سے ہیں۔ یہ سب جانور شاعر کے خیال میں خیالاتِ فاسد اور نحل کی علامتیں ہیں۔ یہاں شاعر ایک کالے ناگ کو دیکھتا ہے۔ یہ کالا ناگ ہر شے

کو، جو سامنے آتی ہے نگل جاتا ہے۔ شاعر نے پیرِ مرد سے پوچھا یہ کون ہے؟ اس نے کہا یہ موت ہے (موت کا فرشتہ عزرائیل ہے)۔ اس سے مت ڈر۔ چونکہ تو میرے ساتھ ہے یہ تجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا ـــــ وہاں سے یہ دونوں مسافر ایک وادی میں پہنچے جہاں شاعر نے بہت سے دیو دیکھے، جن کی آنکھیں ان کی گردنوں پر لگی ہوئی تھیں اور ان کے دل میں آگ ہی آگ تھی ـــــ اسے شاعر نے کینہ کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔

یہ دونوں مسافر وہاں سے ایک اور منزل پر پہنچتے ہیں جہاں کالے اور وحشی بھوت ہی بھوت ہیں۔ یہ سب بے حیا، بد نظر اور شدید غصہ والے ہیں۔ یہاں طمع کو شاعر نے علامتی رنگ میں پیش کیا ہے۔

وہاں سے دونوں لبِ دریا پہنچتے ہیں۔ پانی دیکھ کر شاعر ڈر جاتا ہے۔ رہنما کہتا ہے مت ڈرو۔ ہمت کرو اور آگے بڑھو۔ تمہارے ساتھ موسیٰؑ اور عصا ہیں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ آخر روانہ ہوتے اور یہ دونوں مسافر ایک اور دنیا میں پہنچتے ہیں جہاں سب لوگ قید میں ہیں لیکن قید خانہ نظر نہیں آتا۔ یہاں سب لوگ دیوانے، بیمار اور فرعون ہیں۔

اس کے بعد ہوا کا سفر شروع ہوا۔ یہ لوگ پہلے فلک قمر میں پہنچے، جہاں پانی اور آگ کا قلعہ تھا جس میں جادوگر تھے جن کے سر اژدہا جیسے تھے دم مچھلی کی طرح اور باقی جسم انسانوں کا سا تھا۔ سر چست تھا اور پاؤں سست۔ یہ شاعر نے شہوت کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک پتھر کا حوض تھا جس میں ایک مگرمچھ تھا جس کے سات حلق اور چھ دانت تھے۔ سر پانی کی طرف تھا اور دم آگ کی جانب ـــــ یہ حرص کی علامت ہے۔ اس کے بعد یہ دونوں مسافر برجیس یعنی فلکِ مشتری پر جاتے ہیں۔ وہاں دیو بہت

ہیں۔ بچھو اور سانپ بھی لاتعداد ہیں۔ ساتھ ہی آگ کا پہاڑ ہے۔ یہ قوتِ غضبی کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس کے آگے کنویں ہیں جن میں لوگ اپنی ہی ذات کے بارہ میں باتیں کر رہے ہیں۔ ہر ایک اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ یہاں تکبّر کی صفت بیان کی گئی ہے۔

یہاں سے مسافر فلکِ مریخ و خورشید پر جاتے ہیں۔ وہاں صبح نمودار ہو جاتی ہے۔ وہاں پر شاعر نے دائیں بائیں دور اسنتے دیکھے جن کے بارے میں وہ راہنما سے پوچھتا ہے۔ پیرِ مرد نے بتلایا کہ یہ زمانے کی حدود ہیں ــــ زمانے سے باہر دونوں قدم رکھتے ہیں۔ وہاں ایک گنبد نظر آتا ہے جو شیشے کا بنا ہوا ہے۔ جس میں ہزاروں خوبصورت اور خوش خلق نوجوان ہیں جو نابینا ہیں اور قبلہ کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہاں شاعر ارباب تقلید، اربابِ ظن، سادہ دل لوگوں اور متکبروں اور ریاکاروں کو دیکھتا اور لفظوں میں ان کی تصویر پیش کرتا ہے۔ پھر شاعر مراتب عقل کلّی بیان کرتا ہے (عقلِ کل کو صادرِ اوّل بھی کہا جاتا ہے۔ یوں وہ ذاتِ حق کا پرتو اوّل ہے)۔ شاعر عقل کل کی تعریف و توصیف بیان کرتا ہے جو گویا حمدِ حق ہے۔ اس کے بعد صفت اربابِ توحید بیان کی جاتی ہے۔ پھر سالکانِ طریقت، عابدینِ گوشہ نشین اور اصحابِ رضا و تسلیم کا ذکر ہوتا ہے ــــ اور آخر میں قاضی سرخس، حسن سیف الدولہ محمد بن منصور کی مدح ہے۔

بظاہر یوں لگتا ہے کہ یہ سب کچھ قاضی سرخس کی مدح کی تمہید تھی۔ بہرحال اس مثنوی سیر العباد میں خیالی آسمانی سفر کا عنصر موجود ہے اس لیے یہ بھی جاوید نامے سے پہلے خیالی آسمانی سفر کی ایک کڑی تو ہے ہی!

جاوید نامے کی طرح اس میں بھی آسمانوں کی سیر ہے لیکن مقصود صرف اخلاقی

اور روحانی ہے جبکہ جاوید نامہ میں علامہ نے اخلاقی اور ادبی مقاصد کے ساتھ ساتھ
ملی مسائل اور ان کے حل کو دردمند دل کے ساتھ پیش کیا ہے۔"

جاوید نامہ میں اور طریقۂ خداوندی میں غداروں اور گناہ گاروں کو دکھایا گیا ہے جو اپنے گناہوں اور اپنی غداری کی سزائیں بھگت رہے ہیں جبکہ سیر العباد الی المعاد میں حکیم سنائی نے خود رذایل کو علامتی طور پر پیش کیا ہے۔[۱۰]

"سیر العباد الی المعاد با تصحیح و مقدمہ آقای سعید نفیسی
۱۳۱۶ - چاپ تہران۔"

تقریباً اسی موضوع پر ایک اور کتاب شمس الدین محمد کرمانی (قرن ہفتم) کی "مصباح الارواح" ہے جس میں مصنف چند دوستوں کے ساتھ ایک پہاڑ پر جاتا ہے۔ جہاں اسے ایک بزرگ ملتے ہیں جن سے مصنف حقیقتِ آدم، حقیقتِ ابلیس، مراتبِ ارواح، موت اور قیامت وغیرہ کے بارہ میں سوال پوچھتا ہے۔ پیر مرد جواب دیتا ہے۔ پھر اس پیر مرد کی رہنمائی میں مصنف سفر پہ روانہ ہوتا ہے۔ شہرِ نفسِ امارہ، شہرِ نفسِ لوّامہ اور شہرِ مطمئنہ کی سیر کی جاتی ہے۔ آخر شہرِ نفسِ مرضیہ میں پہنچتے ہیں جس کے رہنے والے عاقلِ حق اور دیوانۂ مخلق ہیں اور تجلیاتِ حق میں محو ہیں۔ سب سے آخر میں شہرِ نفسِ فقیرہ میں جاتے ہیں جو مردِ موحد کا مقام ہے۔

یہ سفر نامہ نظم میں ہے۔ اس مثنوی کے مطالب پہ تصوف کا عنصر غالب ہے۔[۱۱]

معراج رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اثر و نفوذ ادبیاتِ اسلامی میں مختلف جہتوں سے ہوا ہے۔ اسی روایتِ معراج کے زیرِ اثر وہ خیالی دنیاؤں کے خیالی سفر نامے بھی وجود میں آئے جو علماء اور شعراء نے فلسفیانہ یا متصوفانہ مسایل کی توضیح کے لیے قلمبند کیے، جن میں مندرجہ ذیل قصص شامل ہیں:

۱۔ حی بن یقظان از بوعلی سینا

۲۔ حی بن یقظان از ابنِ طفیل

۳۔ قصہ غربتہ الغربیہ از شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول

۴۔ سلامان و ابسال از مولانا عبد الرحمٰن جامی

۵۔ منطق الطیرِ عطار

حی بن یقضان از بوعلی سینا

حی بن یقضان (عربی فارسی زندہ۔ بیدار) ابنِ سینا کی متصوفانہ تمثیل ہے اس میں ایک شخص "حی" جو۔ بیت المقدس کا باشندہ ہے اور جس کے باپ کا نام یقضان ہے، کے احوال کی شرح ہے حی بن یقضان سے مراد عقلِ فعال ہے جس کے ذریعے صوفی وصالِ حق حاصل کرتا ہے۔ حی اپنے باپ یقضان کی وصیت کے مطابق بہت سے شہروں میں گھومتا ہے۔ اس کا باپ اسے تمام علوم کی کنجیاں عطا کرتا ہے۔ حی مصنفِ کتاب کو اپنے ساتھ سیاحتِ عالم کے لیے لے جاتا ہے۔ سب سے پہلے وہ چشمۂ آبِ حیات پر پہنچتے ہیں۔ جو اس چشمے کا پانی پی لے وہ سخت جنگلات اور پہاڑوں سے بآسانی گذر سکتا ہے۔ اس کے بعد عالمِ مادی اور عالمِ معنوی کے مراحل و منازل اور خدا تک پہنچنے کے بارہ میں رمزیہ انداز میں حقایق بیان کیے جاتے ہیں۔ آخر میں وحدت الوجود پہ بحث ہے۔[الف]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سیر العباد سنائی میں بھی رہنما عقلِ مستفاد ہے۔ دونوں آسمانی سفروں میں عقل کی سیادت تسلیم کی گئی ہے۔ جاوید نامہ میں رہنما روحِ رومی بنتی ہے جو جذبۂ عشق و روحانیت کی علامت ہے۔

حی بن یقضان از ابنِ طفیل

یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ تمثیل ہے جس میں فطرت و جبلتِ انسانی کے

[الف] زندۂ بیدار : ترجمہ بدیع الزمان فروزانفر تہران

ص ۱۶۱ - سالِ اشاعت ۱۹۵۶ء

پوشیدہ پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

اس قصے کے مطابق ایک جزیرۂ ہند کا راجہ اپنی بہن کی شادی نہیں کرتا۔ اس صاحبِ جمال شہزادی نے راجہ کے ایک مصاحب سے خفیہ شادی کرلی۔ ایک لڑکا پیدا ہوا مگر راجہ کے خوف سے اس نومولود کو صندوق میں بند کر کے سمندر میں پھینک دیا۔ اتفاق سے اس صندوق کو سمندر کی تند و تیز موجوں نے ایک دوسرے جزیرے میں پہنچا دیا۔ ایک ہرن وہاں سے گزرا۔ اس نے اس صندوق میں جو موجوں کے سخت تھپیڑوں سے ٹوٹ گیا تھا، ایک بچہ پڑا ہوا دیکھا۔ اس ہرن نے بچے کو پالنا شروع کر دیا۔ اسی بچے کا نام حی بن یقظان تھا۔

اس جزیرے کے قریب ایک اور جزیرہ تھا جس میں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک کا نام سلامان تھا جو علومِ ظاہری کا عالم تھا اور دوسرے کا نام ابسال تھا جو علومِ باطنی کا ماہر تھا۔ ابسال ریاضت و عبادت کے لیے اس غیر آباد جزیرے میں پہنچا تو اس کی حی بن یقظان سے ملاقات ہوئی جو وحشیانہ زندگی گزار رہا تھا۔ دونوں میں محبت ہو جاتی ہے۔ ابسال، حی بن یقظان کو اپنے جزیرے میں لے آتا ہے۔ حی جزیرے کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہے اور ان کے سامنے اسرارِ الٰہی بیان کرتا ہے جس پر جزیرے والے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ سلامان، ابسال کا بھائی حی بن یقظان کو وعظ و نصیحت کرنے سے منع کرتا ہے جس پر دونوں یعنی ابسال اور حی رنجیدہ ہو کر واپس اپنے غیر آباد جزیرے میں چلے جاتے ہیں۔[1]

قصہ غربتہ الغربیہ از شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول

یہ قصہ حی بن یقظان ابن سینا کا تتمہ ہے جس کا موضوع متصوفانہ اشراقی افکار ہیں۔ مصنف اپنے بھائی عاصم کے ساتھ بلادِ مغرب میں ساحلِ سمندر یا دریائے سبز پر پرندوں کے شکار کے لیے

---

[1] زندہ بیدار: ترجمہ حی بن یقظان از استاد بدیع الزماں فروزانفر۔ ص۔ ۲۰۔ طبع تہران۔ سالِ ۱۹۵۶ء

جاتے ہیں۔ شہر قیروان کے رہنے والے ان کو پکڑ کر قید میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ قید خانہ ایک کنواں ہے جس کے اوپر بُرجوں والا قصر مشیّد ہے۔ دن اس کنویں کے قید خانے میں گزارتے تھے اور رات کو ان کو اجازت تھی کہ اوپر محل میں آجائیں۔ مصنف کے بقول:

"ایک رات کہ چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ہم اس قید سے بیزار تھے۔ ہُدہُد نے ہمیں وادیِ ایمن سے ایک رقعہ پہنچایا جس میں لکھا تھا کہ تم اپنے بھائی کے ساتھ سفر کرو"۔

پس ہدہد کی رہنمائی میں وہ سفر پر روانہ ہوئے۔ مختلف منازل طے کر کے اجرامِ فلکی کی سیر کی۔ وہاں سے آبِ حیات کے چشمے پر رسائی حاصل کی۔ پھر آخر وادی سینا میں پہنچے۔ پدر بزرگوار سے ملاقات ہوئی۔ یہ پدر بزرگوار تمام نور و روشنی تھا جس کی چمک سے زمین و آسمان قریب تھا کہ پھٹ جائیں۔ مصنف نے پدر بزرگوار کو سلام کیا اور قید خانۂ قیروان کی شکایت کی۔ اس نے کہا:

"تم رہائی تو پا گئے لیکن ایک بار پھر قید خانۂ غربی میں بھی زندانی ہو گے"۔

مصنف یہ سن کر خوب رویا۔ پدر بزرگوار نے کہا:

"اس دفعہ تمہارا واپس جانا ضروری ہے تاکہ دوبارہ یہاں آؤ اور جنتِ ابدی میں رہو"۔

ابھی مصنف اسی گفتگو میں تھا کہ اچانک وہ ایک گڑھے میں گر پڑا اور قید خانۂ غربی میں مقید ہو گیا۔ الف

سلامان و ابسال از عبدالرحمٰن جامی

مولانا عبدالرحمٰن جامی نے ایک مثنوی سلامان و ابسال کے نام سے تحریر کی۔ اس مثنوی میں ایک بادشاہ کے گھر ایک حکیم کی تدبیر سے بیٹا بغیر ماں کے پیدا ہوا۔ اس کا نام سلامان رکھا گیا۔ چونکہ ماں

الف: ترجمہ قصہ غربۃ الغربیہ سہروردی از استاد فروزانفر
ص ۱۷۷۔ طبع تہران - ۱۹۵۶ء

نہیں تھی اس لیے دودھ پلانے کے لیے ایک دایہ ابسال نامی رکھی گئی۔ اس کی عمر ۱۸ سال تھی۔ ابسال سلامان پر عاشق ہو جاتی ہے۔ دونوں فرار ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں گھومتے ہیں۔ جزیرۂ خرم میں پہنچتے ہیں۔ بادشاہ سلامان کی تلاش کرتا ہے۔ دونوں مل جاتے ہیں۔ بادشاہ بیٹے کو ملامت کرتا ہے۔ سلامان باپ کی ملامت سے دل برداشتہ ہو کر صحرا میں آگ روشن کرتا ہے اور دونوں یعنی سلامان اور ابسال اس آگ میں کود جاتے ہیں۔ سلامان بچ جاتا ہے۔ ابسال جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔

اس قصے سے مولانا جامی نے اخلاقی اور عرفانی نتائج اخذ کیے ہیں۔[الف]

منطق الطیرِ عطار

منطق الطیر شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری کی مثنوی عرفانی ہے۔ اس میں پرندوں کی مجلس برپا ہوتی ہے تاکہ وہ اپنا بادشاہ منتخب کریں۔ ہدہد پرندہ، سیمرغ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ سات دشوار گزار منازل طے کرنے کے بعد صرف تیس پرندے بے بال و پر رہ جاتے ہیں۔ باقی راہ کی صعوبتوں کو جھیلتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ یہ تیس پرندے سیمرغ کے دربار میں پہنچتے ہیں۔ وہاں یہ تیس پرندے (سی مرغ) سوائے سیمرغ کے یعنی اپنے سوا کسی کو نہیں پاتے۔

اس مثنوی میں تمثیلات و رموز و اشارات ہیں۔ پرندوں سے مراد سالکانِ راہِ حق ہیں اور سیمرغ سے مراد وجود باری تعالیٰ ہے اور ہدہد سے مراد مرشد ہے اور ہفت وادی سے مراد ہفت منازلِ سلوک ہیں یعنی طلب، شوق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت، فقر و فنا۔ اس مثنوی کا مقصد کثرت کو وحدت میں اور وحدت کو کثرت میں ثابت کرنا ہے یعنی طالب اور مطلوب ایک ہیں۔

ان تمام مذکورہ بالا قصوں میں خیالی دنیاؤں یا آسمانوں کا سفر ہے۔ اس کے علاوہ منطق الطیر کی سات منازل معراجِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفرِ آسمانی میں سات آسمانوں کے سفر سے

[الف] سلامان و ابسال با مقدمہ رشید یاسمی ۱۳۰۶ - تہران

مماثلت کی حامل ہیں۔ عطار کی منطق الطیر اور سہروردی کی غربتہ الغربیہ میں ہدہد اور بوعلی سینا کے حی بن یقضان میں خود حی بن یقضان، معراجِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حضرت جبریلؑ کی رہنمائی سے مشابہت رکھتے ہیں۔

منطق الطیر کی طرز پر اسلامی ادبیات میں کئی اور خیالی سفرنامے بھی ہیں جیسے رسالۃ الطیر ابنِ سینا جس کا فارسی میں ترجمہ شیخ اشراق یحییٰ سہروردی مقتول نے لسان الحق کے نام سے کیا ہے۔ اس ترجمہ کے علاوہ شیخ اشراق یحییٰ سہروردی مقتول نے ایک اور رسالہ الغربتہ الغربیہ اسی طرز پر تحریر کیا ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے ـــــ نیز منطق الطیر کی طرز پر احمد غزالی کی تصنیف رسالۃ الطیور اور نجم الدین رازی کا رسالۃ الطیور ہے۔ اگرچہ کتاب کا نام ایک ہی ہے یعنی رسالۃ الطیور لیکن مصنف دو ہیں:

۱۔ امام احمد غزالی اور

۲۔ نجم الدین رازی

سہروردی کے ترجمۂ رسالۃ الطیر (اصل مصنف ابنِ سینا) میں ایک پرندے کی داستان ہے جو تمامتر رمز و اشارات سے پُر ہے۔ یہ پرندہ کہتا ہے کہ:

"میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اڑ رہا تھا کہ اچانک صیاد کے جال میں پھنس گیا۔ ہم نے جتنی آزادی کی کوشش کی اتنی ہی بندش سخت ہوتی گئی۔ آہستہ آہستہ ہم اس قید کے عادی ہو گئے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ میرے چند ساتھی اس جال سے باہر نکل آئے تھے۔ اگرچہ ان کے پاؤں پر بندشیں باقی تھیں لیکن وہ اڑ سکتے تھے۔ میں نے ان سے مدد کی درخواست کی۔ پہلے تو وہ راضی نہ ہوئے کہ کہیں یہ بھی صیاد کا کوئی فریب نہ ہو لیکن بعد میں میری منت سماجت پر اور پرانی دوستی کا واسطہ دینے پر انہوں نے میری مدد کی اور میں قفس سے باہر نکل آیا۔ اگرچہ میرے بھی پاؤں میں بند باقی رہے۔ پھر ہم

سب سفر پر روانہ ہوئے۔ آٹھ بلند ترین پہاڑوں پر سے پرواز کرتے ہوئے ہم بادشاہ کے حضور میں پہنچے۔ اور بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ ہمارے پاؤں کی بیڑیاں کھول دے۔ جواب ملتا ہے :

"بنداز پای شما کسی کشاید کہ بستہ است۔ ومن رسولی باشما فرستم تا ایشانرا الزام کند تا بندہا از پای شما بردارند"۔

"تمہارے پاؤں کے بند وہی کھول سکتا ہے جس نے یہ بند باندھے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ اپنا سفیر بھیجتا ہوں تاکہ وہ اس کو مجبور کرے کہ وہ تمہارے پاؤں کے بند کھول دے"۔

نجم رازی کے رسالۃ الطیور کا مقدمہ از محمد امین ریاحی۔ طبع تہران ۱۳۶۲ھ۔ ص ۸۶

غزالی کے رسالۃ الطیور میں پرندے سیمرغ کی بارگاہ میں جاتے ہیں تاکہ اسے اپنا بادشاہ بننے پر آمادہ کریں۔ اول انکار ہوتا ہے۔ آخر کار یہ درخواست قبول کر لی جاتی ہے۔

نجم الدین کے رسالۃ الطیور میں پرندے سلیمان کبریا کے دربار میں جاتے ہیں تاکہ وہ "عنقائے مغرب" کے لیے فرمان جاری کرے کہ عنقائے مغرب جو حکمرانِ زمانہ ہے خود جاکر عوام کو ظلم سے رہائی دلائے۔

نجم الدین رازی کے رسالۃ الطیور میں یہ سفرِ آسمانی یوں بیان ہوتا ہے کہ

صبح سویرے میں (مصنف) نے لاکھوں پرندوں کو دیکھا کہ منہ چھپائے پر پھیلائے فریاد کرتے ہوئے دروازے پر بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ کیوں یہ آہ وزاری ہے؟ اسی اثنا میں ایک طوطے (توتے) کو دیکھا جو سبز قبا اندک بقا شیریں لقا شکر شکن تھا۔ وہ میرے سامنے آیا اور یوں گویا ہوا کہ ہم پر جو ظلم ہو رہے ہیں اور مصایب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں ان کی تفصیل حضرت سلیمان کبریا کی خدمت میں پہنچا دے کہ خدا تجھے ثواب عطا کرے گا

اور ہم تیرے ممنون ہوں گے۔ حضرت سلیمان کبریا کو بتا دے کہ جو کچھ عذاب ہم پہ ہو رہا ہے اس لیے ہو رہا ہے کہ عنقائے مغرب جو ہمارا بادشاہ ہے، اس نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے اور ہماری سرپرستی سے دست کش ہو گیا ہے۔

میں اس طوطے کی باتوں سے ایسا متاثر ہوا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے ہامی بھر لی کہ ان کے مصایب و آلام کی داستان حضرت سلیمان کبریا کی خدمت میں ضرور پہنچاؤں گا۔ چنانچہ سارے پرندے چلے گئے اور میرے دل کا کبوتر حضرت سلیمان کبریا کی طلب میں روانہ ہوا۔ پہلی منزل میں ایک ویرانے میں پہنچا جہاں دیو اور بھوت رہتے تھے۔ اس کے بعد آگے بڑھا تو دو عورتیں دیکھیں۔ ایک کا رنگ سیاہ، ایک کا رنگ سبز تھا اور باہم یکجان دو قالب تھیں۔ دو مرد دیکھے۔ ایک کا رنگ سفید اور ایک کا سرخ، جو ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے روانہ ہوا۔ سات آسمانوں کی سیر کی۔ پہلے آسمان پہ ایک حبشی دیکھا جو نور کے لباس سے ہر روز خود کو آراستہ کرتا ہے اور مہینہ میں صرف ایک بار تندرست ہوتا ہے اور باقی تمام روز بیمار ——— (اشارہ ہے چاند کی طرف)۔ دوسرے آسمان پہ ایک بوڑھا دیکھا جو منافق تھا اس سے عطارد سیارہ مراد ہے۔ تیسرے آسمان پہ ایک عورت دیکھی جو مطربہ تھی یعنی زہرہ سیارہ۔ چوتھے آسمان پہ ایک بادشاہ کو دیکھا جس کا چہرہ نورانی تھا یعنی سورج۔ پانچویں آسمان پہ ایک پہلوان دیکھا سرخ چہرہ اور بدخو یعنی مریخ۔ چھٹے آسمان پہ ایک بوڑھا دیکھا جو سعید و خوش بخت تھا، یعنی سیارہ مشتری۔ ساتویں آسمان پہ ایک ہندو بوڑھا دیکھا جو بہت ہی منحوس تھا یعنی سیارہ زحل۔

اس کے بعد بارہ سراپردے دیکھے (یعنی فلک البروج)۔ بعد ازاں ایک اور

پردہ دیکھا جو سراپا نور، خود ہی نقش خود ہی نقاش بھی، رنگا رنگ و بے رنگ
پردہ بھی اور پردہ دار بھی یعنی لوحِ محفوظ۔

جب میرے دل کا کبوتر سلیمان کبریا کے دربار میں پہنچا تو انہوں نے ہدہد کے ذریعے عنقائے مغرب کے نام پیغام دیا۔ وہ پیغام لے کر لوٹا۔ راستے میں ایک کوّا اور ایک باز ساتھ ہو لیے اور ایک لمحے میں سات ولایتوں اور سات سمندروں اور سات آسمانوں سے گزر گیا اور بحرِ اخضر میں پہنچا جس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور گلاب سے زیادہ خوشبودار تھا۔ وہاں ایک جزیرہ دیکھا جس کے گرد ایک خوفناک سانپ گھیرا ڈالے ہوئے تھا۔ بچے اس جزیرے میں کھیل رہے تھے۔ وہاں سے گزرے تو ایک تاریک مقام آیا۔ نہ وہاں زمین نہ آسمان ـــــ وہاں آبِ حیات کا چشمہ ملا۔ اس سے آبِ حیات پیا تاکہ موت سے محفوظ ہو جائیں۔ اس کے بعد کوہ قاف پہنچے جو بے حد بلند تھا۔ وہاں ایک غار نظر آیا جس میں بے انتہا خزانے تھے۔ وہاں سے ہم عنقائے مغرب کے آشیانے میں پہنچے۔ کوّا اور باز پیچھے رہ گئے۔ کبوتر نے صرف وہ پیغام پہنچایا جو سلیمان کبریا کی جانب سے ملا تھا۔"

اس تمثیل میں کبوتر سے مراد قوتِ واہمہ ہے۔ دیو سے مراد مردِ جاہل، کالی عورت سے مراد مٹی، سبز رنگ کی عورت سے مراد پانی، مردِ سفید رنگ سے مراد ہوا، مردِ سرخ رنگ سے مراد آگ ہے۔ کوے سے مراد رات اور باز سے مراد دن ہے۔ جزیرے سے مراد دنیا، بچوں سے مراد مردمانِ غافل، اژدہے سے مراد موت، سلیمان کبریا سے مراد خدائے ذوالجلال، ظلمات سے مراد فتنۂ گیتی، آبِ حیات سے مراد دانش و عقل، عنقائے مغرب سے مراد خواجۂ عزیز و خداوند بزرگوار جمال الدین شرف سلغور۔

گویا یہ قصہ ایک طرح کا قصیدہ بھی ہے۔ اگرچہ اس میں مضامینِ عرفانی بھی ہیں۔ نیز بادشاہ کو اس تمثیل کے ذریعے عوام پر ظلم و ستم کے بارہ میں ایک طرح سے یادداشت پیش کی گئی ہے لیکن

انداز معراجِ خیالی سے مشابہت رکھتا ہے ۔ وہی آسمانی سفر ہے۔ راہنما ہے۔

نجم الدین رازی کا رسالہ برائے رفع ظلم ہے جبکہ منطق الطیر اور رسالۃ الطیر ابنِ سینا اور رسالۃ الطیر الغزالی میں پرندوں کے سفر کا مقصد حصولِ معرفت ہے۔ یوں رسالۃ الطیور نجم الدین رازی اور جاوید نامہ علامہ اقبال میں ایک قدر مشترک ہے یعنی سفرِ آسمانی کا مقصد حصولِ معرفت کی بجائے دنیا والوں کی بھلائی اور خیر و فلاح ہے۔ الف

معراج کا ایک اور پہلو بھی ہے جو خالص ادبی ہے ۔ ادبی پہلو ضروری نہیں کہ اخلاق و مذہب سے بالکل عاری ہو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس میں ادبی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ مشہور عربی نابینا شاعر ابو العلا معری کا رسالۃ الغفران اور شہر زوری کا قصیدہ سفرِ روح اسی ادبی پہلو کا حامل ہے۔ ابو العلا نے رسالۃ الغفران اپنے ایک دوست ابو القارح حلبی کے اس خط کے جواب میں تحریر کیا تھا جس میں ابو القارح نے بطور طنز بد کردار شاعروں اور ادیبوں کو جہنم کا سزاوار قرار دیا تھا۔ ابو العلا نے اپنے رسالہ میں ادبی رنگ میں جنت و دوزخ کی منظر کشی کی ہے اور ان گنہ گار شاعروں کو جنہوں نے مرنے سے قبل توبہ کر لی تھی غفران و رحمتِ کردگار کا حقدار قرار دے کر جنت نشیں دکھایا ہے۔

معراجِ نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی روایت نے مغربی ادبیات پر بھی گہرے نقوش ثبت کیے ہیں جس کی زندہ مثال دانتے الیگزی کی طربیۂ خداوندی ہے۔ میڈرڈ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر آسن کی تحقیقات کے مطابق دانتے کی طربیۂ خداوندی کا ماخذ اولاً وہ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں جن میں معراج کی کیفیات مروی ہیں۔ ثانیاً وہ کتابیں جو اسرارِ معراج کے بارہ میں لکھی گئی ہیں یا جن میں مصنفین نے اپنی سیاحتِ علوی کا ذکر کیا ہے جیسے محی الدین ابنِ عربی کی فتوحاتِ مکیہ اور ابو العلا معری کی رسالۃ الغفران۔

دانتے کی طربیۂ خداوندی کا شروع میں تو عنوان تھا:

رسالۃ الطیور نجم الدین رازی (۵۷۳ - ۶۵۴) بہ تصحیح و مقدمہ
از دکتر محمد امین ریاحی۔ چاپ تہران۔ ص ۸۴ تا ۱۱۰

The Comedy of Dante Alighieri, A Florentine by birth but not in character.

یعنی طربیہ دانتے الیغری جو پیدائش کے لحاظ سے فلورنسی ہے لیکن کردار میں فلورنسی نہیں

بعد میں اس کتاب کے نام کے ساتھ عقیدتمند قارئین نے لفظ Divine کا اضافہ کر دیا سو اب تک Divine Comedy کے نام سے مشہور ہے۔

کتاب کے تین حصے ہیں:

۱۔ دوزخ

۲۔ اعراف

۳۔ جنّت

یہ خیالی آسمانی سفرنامہ مختصراً یوں ہے کہ:

"شاعر ایک رات بے خودی کے عالم میں ایک تاریک اور گھنے جنگل میں گم ہو جاتا ہے۔ درختوں کے اس پار اسے ایک پہاڑ نظر آتا ہے جس کی چوٹی طلوع ہوتے سورج کی کرنوں سے منور تھی۔ شاعر پہاڑ پر چڑھنا شروع کرتا ہے تو فوراً ایک چیتا، ایک شیر اور ایک بھیڑیا اس کی راہ روک لیتے ہیں۔ وہ خوفزدہ ہو کر واپس ہونے والا ہی ہوتا ہے کہ عظیم فلسفی ورجل کی روح نمودار ہوتی ہے ورجل سے دانتے روحانی عقیدت رکھتا تھا۔ ورجل کی روح نے اسے بتایا کہ وہ دانتے کی مدد کے لیے آئی ہے اور اسے تین مقدس خواتین نے بھیجا ہے

یہ تین خواتین ہیں:

۱۔ حضرتِ مریمؑ جو آسمانی رحمت کی نشانی ہیں

۲۔ سینٹ لوسی جو نورانی عظمت کی نشانی ہے

۳۔ بیاطریچے جو دانتے کی محبوبہ تھی (بیاطریچے کی شادی ایک بنکر سے ہوئی تھی بعد میں بیاطریچے کا انتقال ہو گیا تھا)۔

ورجل شاعر سے کہتا ہے کہ پہلے دوزخ سے گزرنا ہوگا، پھر اعراف سے۔ اس کے بعد جنت میں داخل ہو سکیں گے۔ شاعر ورجل کی رہنمائی میں سفر کا آغاز کرتا ہے۔

پہلے دوزخ میں سے گزرنا ہوتا ہے۔ دوزخ کے تین حصے ہیں:

۱۔ عیش کوشی

۲۔ وحشت و بہیمیت

۳۔ بغض و عناد

مسافر دیکھتے ہیں کہ ان تینوں حصوں میں گناہگاروں کو اپنے اپنے گناہوں کے مطابق سزائیں دی جا رہی ہیں۔ راندۂ درگاہ فرشتے یا بد روحیں ان حصوں کی پاسبان ہیں اور وہی گناہگاروں کو اذیتیں دے رہے ہیں۔ ان سب کے درمیان میں شیطان ہے جو برف میں دھنسا ہوا ہے۔ شیطان تین چہروں اور چھ پیروں والا ایک خوفناک عفریت ہے۔

دوزخ کے تمام حصوں کی سیر کرنے اور چند گنہ گاروں سے گفتگو کرنے کے بعد دونوں مسافر عرفات کے پہاڑ پر پہنچتے ہیں۔ اس پہاڑ کی اوپر کی سطح پر سات ڈھلوانیں ہیں جہاں تایب کرنے والی روحیں توبہ اور تربیتِ نفس کرنے میں مصروف ہیں۔ ان روحوں نے وہ بڑے سے بڑے گناہ کیے تھے جو تمام گناہوں کے سرچشمہ ہیں۔ پہاڑ کی نچلی سطح کی ڈھلوان پر وہ لوگ ہیں جن کو غفلت اور حکم عدولی کی بنا پر ابھی تک تربیتِ نفس کرنے کی اجازت نہیں ملی۔

پہاڑ کی بالکل چوٹی پر باغِ عدن ہے۔ جہاں باغات میں پرندے ہیں، پھول ہیں اور نہریں ہیں۔ یہاں دانتے کی ملاقات اپنی محبوبہ بیاطریچے سے ہوتی ہے۔ اسکی

راہنمائی میں دانتے جنت اور آسمانوں کی سیر کرتا ہے جہاں اس کی عظیم شخصیتوں کی ارواح سے ملاقات ہوتی ہے۔ آخر میں عرشِ معلیٰ پر پہنچتے ہیں۔ شاعر جلوۂ حق سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ تجلیِ حق دیکھ کر ایسا مبہوت ہوتا ہے کہ قوتِ گویائی جاتی رہتی ہے۔

To the high fantasy here power failed.

درجل انسانی استدلال و منطق کی علامت ہے۔ میتھلیڈا جو جنت کے باغ کی محافظہ ہے۔ پاک اور معصوم زندگی کا کامل نمونہ ہے۔ دو بیاطرنیچے کشف اور الہام کا استعارہ ہے اور ولی برنارڈ وحی کی علامت ہے جو استدلال منطق اور کشف و الہام سے بلند تر ہے۔

کتاب میں ۳، ۷، ۹، ۱۰ کے ہندسوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ تمام کتاب میں ایک پراسراریت سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔[الف]

دانتے الیغری کی طربیۂ خداوندی کو معراج کے ادبی پہلو کا دوسرا بڑا نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ جناب چوہدری محمد حسین کے خیال کے مطابق معراجِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا میں مشہور ہونے کے چھ سو سال بعد دانتے نے اپنی خیالی معراج کے ذریعے مغربی عیسائی اقوام کو ان کی اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی بدحالی کا نقشہ دکھا کر یورپ کی عام علمی و سیاسی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ دانتے کی موت سے تقریباً چھ سو سال بعد علامہ اقبالؒ نے اپنی خیالی معراج یعنی جاوید نامہ کے ذریعہ ملتِ اسلامیہ کو اس کی اخلاقی، سیاسی اور معاشی پستی کی تصویر دکھائی ہے۔ جاوید نامہ بقول چوہدری محمد حسین "اس حصۂ دنیا یعنی دنیائے اسلام میں ویسے ہی انقلابات کا پیش خیمہ ہونے والا ہے"۔[۱۲]

جاوید نامہ معراجِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادبی پہلو کا تیسرا بڑا نمونہ ہے اور اسلامی ادبیات

The Divine Comedy of Dante Alighieri,

Carlyle - Wicksteed Translation - Modern Library New York

ہیں اپنی خاص نوعیت اور مقصد کے اعتبار سے عدیم النظیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مندرجہ ذیل امتیازی خصوصیات کو نظر میں رکھا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ جاوید نامہ دانتے کی طربیۂ خداوندی سے بھی زیادہ بلند پایہ تصنیف ہے۔

۱۔ جاوید نامہ میں طربیہ خداوندی کی طرح ناقابلِ فہم رمزیت Symbolism نہیں جس کی وجہ سے آج تک طربیہ خداوندی کے بعض مطالب معمہ بنے ہوئے ہیں۔

۲۔ طربیہ خداوندی کی محرک اس کی اپنی محبوبہ بیاطریچے Beartice کی محبت ہے جیسا کہ اس نے اپنی داستانِ نو میں لکھا ہے کہ وہ طربیہ خداوندی کے ذریعے اس کو لافانی بنانا چاہتا تھا۔ جاوید نامہ کا محرک کسی عورت کی محبت نہیں۔ ہاں البتہ بنی نوع انسان کی محبت کو اس کا محرک کہہ سکتے ہیں۔

۳۔ دانتے نے زیادہ تر طربیہ خداوندی میں منظر نگاری کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوزخ، برزخ اور جنت کے مناظر کی تصویر کشی دلآویز بھی ہے اور اثر انگیز بھی۔
لیکن علامہ نے منظر نگاری پہ زیادہ توجہ دینے کی بجائے حقائقِ حیات اور اسرارِ زندگی کو حکیمانہ انداز میں اپنے شعروں میں یوں سمویا ہے کہ ہر شعر حکمت کا تراشیدہ گوہر لگتا ہے۔

۴۔ جاوید نامہ میں طربیہ خداوندی کی طرح دوزخ اور اعراف کا ذکر نہیں۔ جن لوگوں کو واصلِ جہنم دکھانے کی ضرورت تھی ان کو فلک زحل کے ایک قلزم خونیں میں دکھایا گیا ہے۔ علامہ نے صرف چھ سیاروں کی سیر کی۔ ان سیاروں کو انہوں نے افلاک کا نام دیا ہے۔ اس کے بعد جنت اور "حضور" و تجلّی کا ذکر ہے۔

۵۔ دانتے کے پاس کوئی پیغامِ حیات نہیں اور نہ اس کے پاس اپنا کوئی فلسفۂ زندگی ہے

جسے وہ اپنی تصنیف میں پیش کر سکتا۔ اس کے برعکس حضرت علامہ خود ایک بہت بڑے فلسفی تھے اور ایک فلسفۂ زندگی کے بانی بھی۔ انہوں نے نوعِ انسانی کو ایک نئی زندگی کا پیغام دیا ہے کہ انسان اپنی حقیقت سے آشنا ہو جائے تو یہ مادی دنیا کیا چیز ہے۔ عالمِ افلاک بلکہ لوح و قلم بھی اس کے ہیں۔ اہلِ جہاں کے لیے ہر قسم کے شر و فساد سے پاک معاشرہ کی تشکیل کے لیے قرآنی محکمات پر مبنی نظامِ زندگی کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

۶۔ دانتے کی نظر میں زیادہ تر حیات بعد الموت کے مسائل ہیں۔ جاوید نامہ میں حیات بعد الموت کے مسئلہ پر کم تعرض کیا گیا ہے۔ زیادہ تر توجہ موجودہ زندگی یا بقائے حیاتِ انسانی کے مسئلہ پر صرف کی ہے۔

علامہ کے نزدیک یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ مرنے کے بعد جنت ملے گی یا دوزخ یا اعراف۔ بلکہ ان کے نزدیک سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم اس ارضی و عارضی زندگی کو کس طرح نکھار، سنوار کر ابدیت سے ہم کنار کر سکتے ہیں۔ وہ دنیا کے انسانوں کو ایک ایسے جہان کی تعمیر کی دعوت دیتے ہیں جو مشرق کے اقتصادی زوال اور مغرب کے اخلاقی انحطاط سے پاک ہو۔ جہاں ان کو مادی اور روحانی ترقی کی معراج حاصل ہو۔ تاکہ انسان صحیح معنوں میں نائبِ حق یا اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق بن سکے۔

۷۔ علامہ کی نظر میں آفاقیت، کائنات کی وسعت اور انسان کی عظمت ہے۔ گوتم بدھ زرتشت، بھرتری ہری، وشوامتر، جو دوسری اقوام اور مذاہب کے رہنما ہیں۔ ان کی نگاہ میں بحیثیت انسان عظیم ہیں۔ ان عظیم ہستیوں کے افکار کو جو ان کے اپنے افکار سے مطابقت رکھتے تھے، جاوید نامہ میں پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وسیع القلبی اور وسیع النظری کا مظاہرہ علامہ اقبال ہی کر سکتے تھے۔

کہ جن کا خدا رب العالمین ہے۔ جن کا پیغمبر رحمتؐ للعالمین ہے اور جن کا قرآن ذکر للعالمین ہے۔ جن کا دین دشمنوں سے بھی انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ان کے فکر اور شخصیت میں یہ آفاقیت، یہ مذہبی رواداری، یہ عظمت، ان کے دین ہی کی دین ہے لیکن دانتے الغیری آسمانوں کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی تعصب اور تنگ نظری کی پستیوں سے نہ نکل سکا۔ اس نے طربیہ خداوندی میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؓ کی شانِ مبارک میں جس خبث باطنی کا مظاہرہ کیا ہے[۱۳] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنا چھوٹا انسان تھا۔ انسانیت کی نظر میں اس کی طربیہ خداوندی کا کیا مقام ہے؟ اہلِ نظر خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔[۱۴]

جاوید نامہ کی ارزشِ ادبی

جاوید نامہ پہلی بار ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں جاوید نامہ کے آغاز میں دیباچہ[۱] کے طور پر مندرجہ ذیل دو شعر تھے جو بعد کے ایڈیشنوں سے خارج کر دیے گئے۔

خیال من بتماشائے آسماں بودہ است
بدوشِ ماہ و بآغوشِ کہکشاں بودہ است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بودہ است

یہ اشعار انسانی زندگی کا نصب العین پیش کرتے ہیں اور جاوید نامہ کے مطالب، موضوع اور

۱۔ کہتے ہیں پہلے علامہ اقبال کا دیباچہ لکھنے کا خیال تھا لیکن جب ۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ چھپا تو بغیر دیباچے کے تھا: رسالہ غالب ص ۲۵ (جاوید نامہ پر مضمون، جگن ناتھ آزاد)۔

مقصد پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جاوید نامہ کا نام بقول چوہدری محمد حسین مرحوم[۱۵] حضرت علامہ کے صاحبزادے جناب جاوید اقبال کے نام کی مناسبت کی وجہ سے بھی ہے لیکن "بقاو دوامِ حیاتِ انسانی کے مباحث بھی اشارہ کرتے ہیں کہ اقبال نے اس تصنیف کا نام "جاوید نامہ" کیوں رکھا"۔

جاوید نامہ بحرِ رمل مسدس مقصور میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ مثنوی کی مشہور بحر ہے۔ علامہ نے اس سے پہلے بھی اپنی دو مثنویاں یعنی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی اسی بحر میں لکھی تھیں۔ مولانا روم کی مشہور مثنوی اور فرید الدین عطار کی منطق الطیر بھی اسی بحر میں ہیں۔ مثنوی مولانا روم اور منطق الطیر ایک اور لحاظ سے جاوید نامہ کی پیشرو بھی ہیں کہ ان میں بھی جاوید نامہ کی طرح دینی اور دنیوی مسائل کو حکیمانہ اور متکلمانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں مثنویوں کا اندازِ بیان بھی جاوید نامہ کی طرح تمثیلی ہے اور رمزیت سے پُر ہے!

علامہ نے اپنی اس مثنوی میں ایک جدت بھی کی ہے کہ کہیں کہیں اپنے خیالات و افکار کو اپنی یا کسی اور بڑے شاعر کی غزل، شعر یا قطعے کے ذریعے پیش کیا ہے، جو اس طویل نظم کی یکسانیت کے بوجھل پن کو کم کر کے ذہن پر خوشگوار اثر پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ غزل یا قطعہ اس خوبصورتی اور موزونیت سے نظم کے خاکے میں منطبق ہوا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پیش کردہ خیال اگر مثنوی کی اختیار کردہ بحر میں ادا کیا جاتا تو شاید اتنا اثر انگیز نہ ہوتا۔ جاوید نامہ کی بہت سی شعری اور فنی خوبیوں کے علاوہ چند ایک یہ بھی ہیں:

۱۔ علامہ نے جاوید نامہ کے مختلف کرداروں میں اس فنکارانہ چابک دستی سے اپنے ذاتی افکار اور احساسات کا رنگ بھرا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر کردار ان کے فلسفۂ زندگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔

۲۔ جاوید نامہ میں ہر کردار کی زبان اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہے مثلاً:

ا۔ شیطان کا پُرجوش اندازِ تکلم اس کی باغیانہ ذہنیت کا عکاس ہے۔ اس کی

جوشِ حیات سے لبریز گفتگو اس کے جوشِ عمل کی کیفیت کو پیش کرتی ہے؛

ب۔ چنگیز کے لہجہ کا اکھڑپن اور بے دھڑک بات کرنے کا انداز اس کی سپاہیانہ تربیت کا غماز ہے۔

ج۔ بابی مبلغہ قرۃ العین طاہرہ کے کلام کا ایک ایک لفظ اس کے اس جذبۂ اخلاص کی نمائندگی کرتا ہے جو وہ اپنے تبلیغی مشن سے رکھتی تھی۔

۲۔ جاوید نامہ میں شروع سے آخر تک ایک ایسی فضا کا احساس ہوتا ہے جس میں تعصب اور تنگ نظری کی گھٹن نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی محبت ہے۔ زندگی کی حرارت ہے۔ جوشِ عمل ہے۔ مسائلِ حیات کو سمجھنے اور سمجھانے کا فکر ہے۔ عالمگیر اصلاح کا عزم ہے۔ ایک سنہری دور کی آرزو ہے۔ ہر کردار انسان کی بدحالی اور گمراہی سے متفکر ضرور نظر آتا ہے لیکن مایوس نہیں پُرامید ہے کہ یہ مشتِ خاک (انسان) ایک دن رشکِ گردوں بنے گی۔

الفاظ کی مصوری اور ہم آہنگی، تراکیب کی جدت و ندرت، خیال انگیز ایمائیت، فکر افروز معنویت، خونِ جگر اور سوزِ دروں سے مایہ دار شعریت، مقصد کی صداقت و عظمت، تخیل کی بلند پروازی اور حکیمانہ نکتہ آفرینی نے جاوید نامہ کو شاعری کا شاہکار بنا دیا ہے۔

جاوید نامہ کا فکری مقام

جاوید نامہ کو علامہ کی دوسری تصانیف کے مقابلے میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت حاصل ہے۔ علامہ نے اسرار و رموز میں خودی اور بے خودی کا تصور بتمام و کمال پیش کیا ہے۔ گلشن رازِ جدید

لو۔ سید عبدالواحد Iqbal His Art and Thoughts.

میں تصوف کے چند مسائل پر بحث ہے۔ ارمغانِ حجاز میں علامہ نے حمد و نعت اور زندگی کے مختلف موضوعات پر حکیمانہ نکتے بیان کیے ہیں۔ دوسری کتابوں میں بھی غزلیں اور نظمیں ہیں جن میں حقائق و معارف حیات کا اظہار کیا گیا ہے لیکن جاوید نامہ میں علامہ نے انسانی زندگی، کائنات اور خدا کے بارہ میں تقریباً اپنے تمام افکار کو ایک خاص ترتیب اور جامعیت کے ساتھ انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ علامہ کے افکار کی بنیاد قرآنی تعلیمات ہیں جیسا کہ خود انہوں نے فرمایا ہے:

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اور بقول جناب مولانا مودودی[۱۶] "اقبال جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا"۔

حقیقت یہ ہے کہ جب سے فکرِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے وہ اس حقیقت کو سمجھنے اور اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہے کہ "میں خود کیا ہوں؟" "یہ کائنات کیا ہے؟" "خدا کیا ہے؟" "یہ سب کچھ کس نے پیدا کیا؟" "اور کس لیے پیدا کیا؟" "خدا، انسان اور کائنات میں باہم تعلق کیا ہے؟"

تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ اس سوچ اور اس فکر کی افراط و تفریط سے مختلف دنیا گریز اور دین گریز نظریوں اور فتنوں نے جنم لیا۔ مادے کی قوت اور طاقت کے شدید احساس اور مظاہرِ فطرت چاند، سورج، پہاڑ، دریا کے مفید یا مہیب ہونے کے خیال نے ذہنِ انسانی کو اسیر کیا، تو وہ ان مظاہرِ فطرت کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ یوں انسان خود سے بھی گیا اور خدا سے بھی۔ جب دنیا کی بے ثباتی اور روح کی بقا کے تصور نے دل و دماغ پر تسلط حاصل کیا تو اس نے دنیا کو "دنی" یعنی تمام شر سمجھا اور تارک الدنیا بن کر پہاڑوں اور غاروں میں خلوت گزیں ہو گیا اور یوں مرنے سے پہلے ہی مر گیا ـــــ اور جب اس کی اپنی شخصیت اور ذات کا شعور غیر منظم طریقے سے ابھرا تو وہ انانیت اور خود سری کے زور میں اپنے رب اور خالق ہی کا منکر ہو گیا اور فرعون و چنگیز و نمرود کی شکل میں نمودار ہوا اور خود بنی نوع انسان کی تباہی کا موجب بنا۔

قرآن کریم انسان کو خود اس کی اپنی ذات، خدا اور کائنات کا اعلیٰ شعور بخشتا ہے اور انسان، خدا اور کائنات کے باہمی تعلق کو فطری اور متوازن طور پر پیش کرتا ہے، جسے مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان اس کائنات میں خدا کا نائب ہے۔ یہ کائنات انسان کے لیے اور خود انسان خدا کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔

اس حقیقت پر یہ قرآنی آیات شاہد ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ

۱۳ : ۴۵ الجاثیہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۶-۵۱)

اسی مضمون کو علامہ نے جاوید نامہ میں یوں ادا کیا ہے ؎

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم ایں شمشیر را سنگِ فن

لیکن ان تین وحدتوں یعنی انسان، کائنات اور خدا میں انسان ایک بنیادی اکائی ہے جسے خود اپنا، کائنات اور خدا کا شعور بخشا گیا ہے اور یوں وہ خدا اور کائنات میں ایک اتصالی کڑی ہے۔ یہی شعورِ سہ گانہ ہے جو انسان کو خدا کی دوسری مخلوقات پر فوقیت عطا کرتا ہے اور خلافتِ الٰہی کا سزاوار و حقدار بناتا ہے۔ اس شعور کو قرآن کریم کے الفاظ میں:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (اور آدم کو سارے نام سکھائے) (۳۱-۲)

یا

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ (۷۲-۳۳) کے مطابق امانتِ الٰہی کہہ سکتے ہیں اور جسے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ جاوید نامہ کے آغاز میں ان شعورِ سہ گانہ کا ذکر شعورِ خویشتن شعورِ دیگری اور شعورِ ذاتِ حق کے عنوان سے کیا گیا ہے۔

گویا تسخیرِ زمان و مکاں کے لیے یہ شعورِ سہ گانہ یعنی خودی بنیادی ضرورت ہے۔ انسان اپنی ذات کے شعور کے حوالے سے کائنات کا شعور حاصل کرتا ہے اور کائنات کے شعور سے خدا کے شعور تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ قرآنی آیات:

وَفِی الْاَرْضِ آیَاتٌ لِّلْمُوقِنِیْنَ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲۱-۵۱)

"اور یقین لانے والوں کے لیے زمین کے اور تمہاری جانوں کے اندر نشانیاں ہیں۔
کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟"

سَنُرِیْهِمْ آیَاتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ

"جلد ہی ہم ان کو دکھلا دیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کی جانوں میں یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے گا ان کے واسطے کہ تحقیق یہ حق ہے۔ (۴۱-۵۳)

اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اسی طرح قرآن پاک میں "آفلین" والی آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی تمثیل اسی پہلو کی عکاسی کرتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب بتوں کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا تو گویا ان کی اپنی ذات کا شعور بیدار ہوا تھا۔ ان کے اس شعور نے چاند، سورج اور ستاروں پر تحقیقی نظر ڈالی اور آخر انہیں وہ بصیرت حاصل ہو گئی جسے عرفانِ حق کہتے ہیں اور وہ پکار اُٹھے کہ اس کائنات کا ایک ہی خالق ہے جو میرا رب ہے اور اب میں ہر شرک سے پاک ہوا۔

یہ بلوغتِ نظر، یہ بصیرت، یہ عرفانِ حق شعورِ ذات ہی کے حوالے سے حاصل ہوا۔ یہی گویا خودی کا بنیادی نقطہ ہے۔ "یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں

---

۱ - : سورۂ بقرہ : آیت ۱۶۵

کی شیرازہ بند ہے۔ یہ خودی یا "انا" یا "مَیں" یہ بصارت ہی نہیں بصیرت بھی ہے اور عقل ہی نہیں عشق بھی ہے۔ عقل صرف کائنات کے چند حقائق کا کھوج لگا سکتی ہے۔ لیکن لامکان صرف عشق ہی کی زد میں ہے۔

عقل آدم بر جہاں شبخوں زند　　　عشق اُو بر لامکاں شبخوں زند

(عقل انسانی کی زد میں ہے جہاں　　　عشق کی زد میں ہے لیکن مکاں)

عقل چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے۔ عقل غبار راہ میں گم ہے اور پردۂ محمل عشق ہی کی گرفت میں ہے۔ عقل "حضور" سے محروم ہے عشق اس سے مالا مال ہے۔

قرآنی نقطۂ نظر سے عرفان حق ایمان کے بغیر ممکن نہیں اور ایمان کی بنیاد حب اللہ ہے وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ اور چونکہ عرفان حق عرفان کی اعلیٰ ترین صورت ہے اس لیے عشق کی عقل پر برتری بھی مسلم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن پاک میں لفظ عشق استعمال نہیں ہوا۔ قرآن پاک میں لفظ "حب" عشق کے لفظ سے مترادف ہے۔ خود لفظ عشق احادیث اور ایام جاہلیت کی شاعری میں بھی موجود نہیں (بلاالف) اشراقی فلسفیوں نے اس لفظ کو معنویت بخشی۔ اخوان الصفا نے غالباً سب سے پہلے عشق کی تعریف کی جو یوں ہے کہ "عشق نام ہے معشوق کے ساتھ متحد ہونے کے سخت شوق کا"۔ اس کے بعد ایرانی صوفیا اور شعرا نے لفظ عشق کی معنویت کو اپنی نکتہ آفرینیوں سے غیر معمولی گیرائی اور گہرائی عطا کی ان کے خیال میں خداوند تعالیٰ عاشق بھی ہے اور معشوق بھی کیوں کہ وہی حسن و جمال کا منبع ہے اس لیے وہ کسی دوسری چیز پر عاشق نہیں ہو سکتا۔ البتہ وہ اس میں اپنے حسن و جمال کی جلوہ گری کا تماشا دیکھ سکتا ہے۔ کائنات کا وجود اس کے اس جذبۂ عشق کے ظہور کا مرہون منت ہے بقول غالب

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں　　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

کائنات کی ہر شے اسی حسن ازلی اور عشق حقیقی کے فیض ہی سے قائم ہے۔ عشق کے اس نظریہ کے

مطابق ذرّہ سے آفتاب تک ہر چیز میں عشق کی جلوہ فرمائیاں ہیں۔

علامہؒ نے جس عشق کو عقل سے برتر ٹھہرایا ہے وہ نہ تو وہ عشق ہے جو دماغ کا خلل کہا جاتا ہے۔ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا" اور نہ وہ انتہا پسند وجودی صوفیا اور شعرا کا وہ عشق ہے جو تمامتر عجز و مسکنت ہے بلکہ ان کی نظر میں عشق "عقل کی ترقی یافتہ صورت ہے" یہ دانش ایمانی ہے۔ نور ایمان ہے۔ نور بصیرت ہے۔ عین الیقین ہے گرمیٔ حیات ہے۔ تماشائے ذات ہے۔ سوز و ساز زندگی ہے۔ سراپا حضور ہے اور ام الکتاب ہے۔

عقل اشیاء کی جزئیات کا تجزیہ تو کر سکتی ہے لیکن ان کی کلیت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ وہ انسانی زندگی کو تاریخ جغرافیہ، سائنس، طب اور فلسفے کے مختلف خانوں میں تقسیم تو کر سکتی ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے مادی پہلو کی کیفیت و کمیت کو پورے طور پر متعین کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے روحانی پہلو کی آشنائی حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ عقل انسان کو اس دنیا میں چند مادی راحتیں اور لذتیں تو مہیا کر سکتی ہے لیکن مقصد زندگی عطا کرنے سے قاصر ہے۔ یہ صرف عشق یعنی وحی کا کام ہے جو انسان کو اس کے بلند نصب العین سے آگاہ کرتی ہے کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ وحی الٰہی یعنی قرآن کا شعور حیات ہمہ جہتی ہے۔ قرآن پاک انسان کو اشیاء کا جزوی طور پر تجزیہ کرنا نہیں بلکہ کلی طور پر ان کا جاننا اور احاطہ کرنا سکھاتا ہے۔ قرآن کے انسان کے پاؤں زمین پر لیکن اس کی نگاہیں افلاک پر ہوتی ہیں۔ قرآن کا انسان ادھورا انسان نہیں

الف۔ زاد المعاد جلد ۲ ص ۹۶۔ صوفیانہ ادب میں چند احادیث ملتی ہیں جن میں لفظ عشق آیا ہے جیسے فمن عشق فعف فمات فھو شھید یا من عشق وکتم وعف وصبر الخ۔ ہر دو صحیح ہیں۔ ابن جوزی نے ان کا ذکر موضوعات میں کیا ہے۔ رحمۃ اللعالمین از قاضی محمد سلیمان منصور پوری جلد دوم۔

ب خطبہ نمبر ۱

یعنی وہ صرف شکم کی یا مادی ضروریات یا محض قلبی یا روحانی کیفیات کا حامل ہی نہیں بلکہ وہ مکمل انسان ہے جو اپنے جسم و روح کی تمام توانائیوں کے ساتھ "بسطۃً فی العلم والجسم (۲۴۷-۲)" کی مکمل تصویر بن کر اس کائنات میں جلوہ گر ہے۔ جاوید نامہ کا موضوع یہی قرآن کا انسان ہے جسے ہم "انسان کامل" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ انسان جو کائنات اور خدا کے درمیان ایک واسطہ، ایک اتصالی کڑی یا ایک بنیادی وحدت ہے جس کے بغیر ذاتِ مطلق اور کائنات میں رابطہ قائم نہیں ہو سکتا۔ جاوید نامہ کا مقصد انسان کامل کی تشکیل ہے یہ انسان نطشے کا فوق البشر نہیں جو صرف قوت و قہر کا نمائندہ ہے اور اخلاقی اقدار سے یکسر معریٰ ہے۔ اور نہ وہ عبدالکریم الجیلی کا انسان کامل ہے جو صرف الٰہیات و روحانی کیفیات میں مست و مستغرق ہے۔ بلکہ وہ انسان ہے جس کی ایک نظر جلوت یعنی عالم کون و فساد پر اور دوسری نظر خلوت یعنی عالم لامکان پر ہے جو خدا کی تمام جمالی اور جلالی صفات کا مظہر کامل ہے جس میں دلبری بھی ہے اور قاہری بھی جو عقل و عشق کا جامع ہے جو عالم نو کا نقش گر ہے جو مصافِ زندگی میں فولاد ہے اور شبستان محبت میں حریر و پرنیاں۔ جو نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو ہے، جو دیدہ ور بھی ہے اور دانائے راز بھی جو سوارِ اشہبِ دوراں ہے اور فروغِ دیدۂ امکاں جو خود بینی اور جہاں بینی اور خدا بینی کی تمام صلاحیتوں کا حامل ہے جس کا مقصد زندگی اس دنیا میں جہاں انسان انسان کا شکاری ہے جہاں نوعِ انسانی کے استحصال و استیصال کے لیے ملوکیت و اشتراکیت اور سرمایہ داری کے ہمرنگ زمین جال بچھے ہوئے ہیں، جہاں شر کی قوتیں

اقتدار میں ہیں اور اعلیٰ انسانی اقدار مغلوب ہیں، جہاں نفرت ہے، تعصب ہے، غربت ہے، جہالت ہے، ظلم ہے، استبداد ہے۔ محکمات قرآنی کی بناء پر ایک ایسا نظامِ زندگی، ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جو حریت و اخوت و مساوات کا کامل مظہر ہے اور جس کا منتہائے مقصود اس کائنات کو مسخر کر کے اِلیٰ رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔

جاوید نامہ اور مولانائے رومؒ

مولانائے روم کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کا نقش اثر علامہ کے دل و دماغ اور فلسفۂ فن پر بے حد گہرا اور ہمہ گیر ہے جو خاص طور پر جاوید نامہ میں زیادہ نمایاں ہے۔ علامہ مولانا روم کی رہنمائی میں عالم افلاک کی سیر کرتے ہیں، علامہ نے جاوید نامہ کے شروع میں مولانا روم کی یہ مشہور غزل

بکشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزو است
بنمای رُخ کہ باغ و گلستانم آرزو است

تضمین کی ہے جو اس سیاحت علوی اور مشاہدۂ ربانی کے متعلق ان کے جذبات و افکار کی بہتر بن طور پر ترجمانی کرتی ہے۔ مثنوی کے کئی اشعار جاوید نامہ میں تضمین ہوئے ہیں۔ جاوید نامہ کا آغاز مثنوی کے آغاز سے ملتا جلتا ہے۔ جاوید نامہ کے ابتدا میں شکوۂ فراق اور آرزوئے وصال کا اظہار مثنوی کے ابتدائی حصہ سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ شعر و حکمت، عقل و عشق، زمان و مکان، تقدیر و توکل، حرکت و عمل، جنت و دوزخ، شیطان و شیرِ خدا اور علم و فن پر علامہ کے خیالات و افکار بہت حد تک مولانائے رومؒ کے افکار و خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ مولانا رومؒ کا جوش و جذبہ، سوز و مستی، فرشتہ صید پیر شکار و یزداں گیر عزم علامہ اقبال کی شخصیت اور فن میں رچا بسا ہوا ہے۔

مولانا روم کے اس شعر سے کہ

ما ز فلک بر نزیم و ز ملک افزوں تریم — زیں دو چرا نگذریم منزل ما کبریاست

علامہ اقبال خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ اس شعر کی زمین میں انہوں نے ایک مستقل غزل لکھی ہے جس کا آخری شعر یہ ہے

شعلہ؎ درگیر زد برخس وخاشاکِ من

مُرشدِ رومی کہ گفت منزلِ ما کبریاست

اس شعر کو علامہ کی اس خیالی معراج یعنی جاوید نامہ کی تصنیف کا محرک بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق مولانا روم نے مثنوی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ نصیحت یا ہدایت لکھی تھی کہ

"مثنوی را جہت آں نگفتہ ام کہ حمائل کنند و تکرار کنند بلکہ زیر پا نہند و بالا ئے آسماں روند کہ مثنوی نردبان معراج حقائق است۔"

"مَیں نے مثنوی اس لیے نہیں لکھی کہ لوگ گلے میں لٹکائیں اور بار بار پڑھیں بلکہ اس لیے لکھی ہے کہ پاؤں کے نیچے رکھیں اور آسمان پر جائیں کیونکہ مثنوی معراج حقائق کا زینہ ہے۔")

یوں معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے برحیہ مولانا روم کی رہنمائی میں خیالی معراج یا عالم علوی کی سیر کی ہے ایک مرید باصفا کی طرح ان کی اس نصیحت ہی پر عمل کیا ہے۔

جاوید نامہ کے مطالب پر ایک نظر

جاوید نامہ کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے۔ شاعر اس جہانِ ہفت رنگ میں انسان کی ہم نفس سے محرومی کی شکایت کرتا ہے اور ذات حق کے مشاہدہ کرنے کی آرزو کرتا ہے۔ تمہید آسمانی میں آسمان زمین کو بے نور ہوتے کا طعنہ دیتا ہے، زمین خجل ہو کر خدا سے اپنی بے نوائی کا شکوہ کرتی ہے۔ عرش سے ندا آتی ہے کہ تو اپنی حقیقت سے بے خبر ہے ورنہ تُو تو نورِ حقیقی یعنی انسان کی امانت دار ہے۔ اس کے بعد نغمۂ ملایک ہے جس کا بنیادی مضمون یہ ہے کہ عروجِ آدم

خاکی سے زمین ایک دن رشک گردوں بن جائے گی۔ گویا یہی بات آسمانی سفر کی محرک بنتی ہے اور شاعر خلوت کی تلاش میں دریا کے کنارے جاتا ہے۔ غروب آفتاب کا وقت ہے اور نظارہ بے حد سحر انگیز، شاعر دردِ فراق سے بے تاب ہے اور بے اختیار رومی کی یہ مشہور غزل گاتا ہے

بکشای لب کہ قند فراوانم آرزوست

بنمای رُخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

اچانک روحِ رومی ایک پہاڑی کے عقب سے نمودار ہوتی ہے اور موجود و ناموجود، محمود و نامحمود عقل و عشق، جسم و جان اور زمان و مکان کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہے اور فلسفۂ معراج پر روشنی ڈالتی ہے۔ شاعر کا دل سیاحتِ عالمِ علوی کے لیے بے تاب ہوتا ہے کہ ناگہاں زروان جو زمان و مکان کا فرشتہ ہے جس کے دو چہرے ہیں ایک سیاہ اور ایک روشن نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم دل سے "لی مع اللہ" پڑھو تو مجھ سے یعنی زمان و مکان کی قید سے آزادی حاصل کر سکتے ہو۔ پھر اچانک عالمِ رنگ و بو غائب ہو جاتا ہے اور ایک عالم بے ہاؤ ہو سامنے آتا ہے فرشتے زمزمہ سنجی کرتے ہوئے شاعر کا استقبال کرتے ہیں اس کے بعد شاعر مرشد رومی کی رہنمائی میں آسمانی سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ فلکِ قمر پر پہنچتے ہیں جہاں عارف ہندی و شوامتر (جہاں دوست) سے ملاقات ہوتی ہے۔ شاعر سے جہاں دوست کے سوال اور شاعر کے جواب معنوی و ادبی لحاظ سے جاوید نامہ کی جان ہیں۔ یہ حصہ اختصار، جامعیت اور ڈرامائی کیفیت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ عارف ہندی شاعر کے برجستہ جوابات سے خوش ہو کر اپنے نو نکات بیان کرتا ہے جو پُر لطف بھی ہیں اور پُر معنی بھی۔

فلک قمر پر چار طاسین نبوت یعنی طاسین گوتم، طاسینِ زرتشت، طاسینِ مسیحؑ اور طاسین محمدؐ نظر آتے ہیں۔ علامہ نے طاسین سے مراد لوح لی ہے۔ طاسین قرآن پاک کی ایک سورہ "نمل" کا نام ہے یہ حروف مقطعات ہیں۔ حسین بن منصور حلاج نے اپنی تصنیف کتاب الطواسین میں ہر باب یا ہر فصل کا نام طاسین رکھا تھا۔ چونکہ پیغمبروں سے بالمشافہ گفتگو کرنا سوءِ ادب تھا

اس لیے فلک قمر پہ وارد ہر عمید ہیں ان کی طواسین یعنی الواح دکھائی گئی ہیں ہر طاسین کے ساتھ ایک اور شخصیت وابستہ ہے جو اس پیغمبر کی تعلیمات پر روشنی ڈالتی ہے۔ مثلاً طاسینِ گوتم بدھ کے ساتھ زنِ رقاصہ، طاسینِ زرتشت کے ساتھ اہرمن، طاسینِ مسیح کے ساتھ طالسطائی اور طاسینِ محمدؐ کے ساتھ ابو جہل ہے۔ ابو جہل کا نوحہ بڑا ہی دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

فلکِ عطارد پر انیسویں صدی کی دو عظیم شخصیتوں سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی ارواح سے ملاقات ہوتی ہے۔ افغانی مسلم اتحاد کے مشہور راہنما تھے اور سعید حلیم پاشا ترکیہ میں اسلامی نظامِ حیات کے داعی۔ مرشدِ رومی شاعر کا افغانی سے بطور "زندہ رود" تعارف کراتے ہیں۔ شاعر کا یہی نام نظم میں آخر تک استعمال ہوا ہے۔ یہ دونوں حضرات دین و وطن کا صحیح مفہوم بتاتے ہیں اشتراکیت و ملوکیت کے بارہ میں اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ محکماتِ قرآن کی تشریح فرماتے ہیں اور نورِ قرآن سے اپنے فکر کو روشن کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔

فلک زہرہ میں مجلسِ خدایانِ قدیم کا منظر سامنے آتا ہے۔ سارے پرانے خدا بعل و ہبل لات و منات وغیرہ جمع ہیں۔ سب کے دل ضربِ خلیل سے دہشت زدہ ہیں لیکن سب اس عہدِ بے خلیل کو اپنے دوبارہ زندہ ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں۔ بعل خوش ہو کر ایک نغمہ گاتا ہے۔ یہ نغمہ نوحۂ روحِ ابو جہل جو اس نے فلک قمر میں طاسینِ محمدؐ کے ضمن میں کیا تھا، کے بالکل برعکس ہے۔ یہ نغمۂ امید کا نغمہ ہے ـــــ اس کے بعد زہرہ کے ایک دریا کی تہ میں فرعون اور کچنر کی ارواح ملتی ہیں۔ یہ دونوں سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہوئے تھے۔ روحِ مہدی سوڈانی نمودار ہوتی ہے۔ مہدی سوڈانی عربوں کو پیغام بیداری و عمل دیتے ہیں۔

فلک مریخ میں حکیم مریخی سے ملاقات ہوتی ہے۔ مرغدین جو ایک مثالی شہر ہے اس کی سیر کی جاتی ہے۔ تقدیر و تدبیر کے مسئلہ پر حکیم مریخی سے مکالمہ ہوتا ہے وہ اس مسئلہ پر بڑے پتے کی بات کہتا ہے ؎

رمز باریکش بحرفی مضمر است ـــ تو اگر دیگر شوی او دیگر است

(غور کر تو بات ہے بس اتنی سی تو جو بدلے، بدلے قسمت بھی تری)

اس کے بعد ایک وسیع میدان میں بنیۂ مریخ نظر آتی ہے۔ وہ مریخ کی عورتوں کو مردوں کے خلاف بغاوت کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی تلقین کر رہی ہے۔ اس کی تقریر دلچسپ بھی ہے۔ عبرت انگیز بھی اور مغربی تہذیب پر زبردست چوٹ بھی۔

فلکِ مشتری پر منصور حلاج، غالب اور ایران کی مشہور بابی مبلغہ اور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ کی ارواح ملتی ہیں جنہوں نے جنت میں رہنے کی بجائے گردشِ جاوداں کو قبول کیا۔ نوائے غالب نوائے حلاج اور نوائے طاہرہ سننے کے بعد غالب سے اس کے مشہور شعر

قمری کفِ خاکستری و بلبلِ قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

کی شرح پوچھی جاتی ہے۔ غالب نے اپنی ایک مثنوی میں ختمِ نبوت اور رحمت اللعالمین کے موضوع پر لکھتے ہوئے یہ شعر لکھا تھا۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ اللعالمینی ہم بزد

(زندگانی کا ہے ہنگامہ جہاں رحمت اللعالمین بھی ہے وہاں)

علامہ غالب سے اس شعر کی تشریح و توضیح کی فرمائش کرتے ہیں..... غالب کی توضیح و تشریح سے بات کچھ واضح نہیں ہوتی۔ منصور حلاج اس کی وضاحت کرتے ہیں جو بہت پر معنی اور فکر انگیز ہے ـــــ اس کے بعد خواجۂ اہل فراق ابلیس نمودار ہوتا ہے۔ نالۂ ابلیس بہت ہی دلچسپ بھی ہے اور عبرت آفرین بھی۔

فلکِ زحل پر قلزمِ خوں یعنی خون کا سمندر نظر آتا ہے اس میں ایک کشتی ہے جس میں ملک کے دو مشہور غدار جعفرِ بنگال اور صادقِ دکن سوار ہیں جنہیں دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا اور انہیں موت بھی نہیں آتی۔ دونوں کو شدید عذاب میں دکھلایا گیا ہے۔ منظر نہایت ہولناک اور عبرت انگیز ہے۔ روحِ ہندوستان حور کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور فریاد کرتی ہے۔

سرحدِ افلاک سے پرے مشہور جرمن فلسفی نطشے سے ملاقات ہوتی ہے جسے علامہ نے اپنے

دور کا منصور کہا ہے۔

جنت الفردوس میں شرف النسا بیگم کا عالی شان قصر نظر آتا ہے۔ یہ شرف النسا نواب بہادر خان کی بیٹی اور نواب عبد الصمد کی پوتی تھی جو شاہ عالم اور فرخ سیر کے عہد میں پنجاب کے گورنر رہے ہیں ـــــ اس کے بعد سید علی ہمدانی اور ملاّ طاہر غنی کشمیری سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس ملاقات میں خطۂ کشمیر کے ماضی حال اور مستقبل پر گراں بہا خیالات کا اظہار ہوتا ہے ـــــ شاہ ہمدان فقیری اور شاہی پر اپنے گراں قدر افکار بیان کرتے ہیں ـــــ اس کے بعد ہندوستان کے مشہور شاعر بھرتری ہری سے ملاقات ہوتی ہے وہ شعر کی حقیقت پر اظہار خیال کرتا ہے ـــــ اس منظر سے گزر کر کاخ سلاطین مشرق میں نادر شاہ، ابدالی اور سلطان ٹیپو سے ملاقات ہوتی ہے ـــــ سلطان ٹیپوؒ موت و حیات اور شہادت پر اپنے فکر انگیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

حوران بہشتی شاعر سے شعر سنانے کی فرمائش کرتی ہیں جسے شاعر پوری کرتا ہے۔ اس کے بعد علیں حضور میں حاضری ہوتی ہے مرشد رومی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور شاعر تنہا لذت دیدار سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ سوال وجواب ہوتے ہیں۔ ناگہاں تجلی جلال نمودار ہوتی ہے۔ تمام زمین و آسمان نور میں غرق ہو جاتے ہیں۔ شاعر کلیم اللہ کی طرح جلوہ مست ہو کر گر پڑتا ہے تاب گویائی جاتی رہتی ہے۔

حضرت علامہ نے اپنے ایک خطبہ میں مشہور صوفی حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ کا یہ قول کہ

"محمدؐ عربی عرش معلیٰ پر خدا کے پاس پہنچ کر واپس آ گئے واللہ اگر میں وہاں پہنچتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

پیش کر کے صوفی اور پیغمبر کے فرق کو واضح کیا ہے کہ صوفی وجدان رحمت میں غرق ہو کر وہیں رہ جاتا ہے تاکہ اس کو دائمی سکون حاصل ہو لیکن پیغمبر حق کی برکتوں سے اپنی خودی کو مالا مال کر کے پھر دنیا میں پلٹ آتا ہے تاکہ اپنے تخلیقی مشن کو تکمیل کر سکے۔ حضرت علامہ کا پیغمبرانہ انداز ہے۔ وہ تجلی ذات باری میں فنا نہیں ہوتے بلکہ اپنی خودی کو قرب حق سے مالا مال کر کے پھر دنیا میں پلٹ آئے تاکہ اپنے تخلیقی مشن کی تکمیل کریں۔ یوں بقول حضرت گرامی جالندھری ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

حواشی

۱۔ مولوی عبدالحق: اقبال اور غالب کے ذہنی رشتے۔ نقوش کا اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء ص ۲۵۰

۲۔ سید عبدالواحد: Iqbal, his Art and Thought ص ۱۵۸

۳۔ علامہ اسلم جیراجپوری: مضمون جاوید نامہ۔ نیرنگِ خیال۔ اقبال نمبر ۱۹۳۲ء۔ ص ۱۶۸

۴۔ چودھری محمد حسین: ایضاً۔ ص ۲۰۱

۵۔ ارداویراف نامہ: ترجمہ رشید یاسمی از متن پہلوی۔ ارداویراف نامہ منظوم زرتشت بہرام پژدو مرتبہ ڈاکٹر عفیفی

۶۔

۷۔ مشہور مستشرق پروفیسر آسن بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں:
Islam and the Divine Comedy صفحہ ۶، طبع لاہور

۸۔ ایران در زمان ساسانیاں از پروفیسر آرتور کرسٹن سین: ترجمہ رشید یاسمی۔ طبع تہران۔ ص ۹۸

۹۔ تذکرۃ الاولیا: شیخ ابی حامد محمد بن ابی بکر ابراہیم فریدالدین عطار نیشاپوری۔ با مقدمہ استاد میرزا محمد خان قزوینی۔ چاپ تہران۔ ص ۱۶۰-۱۶۲

۱۰۔ اس شعر میں فنی خوبی یہ ہے کہ پہلے مصرع میں صفتِ مقلوب مستوی استعمال کی گئی ہے۔ یار کا اشارائے ہے۔ اس صفت کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ لفظ یا مصرع کو الٹ کر پڑھیں تو وہی لفظ یا مصرع بنے۔ جیسے شاباش۔ یا رُبَّکَ فَکَبِّرۡ (قرآن)۔ امیر خسرو کا شعر ہے ؎

شکر بتر از وئے وزارت بر کش   شو ہمرہ بلبل بلب ہر مہوش

کسی اہلِ علم نے مقلوب مستوی کا ایک جملہ بولا: "مرادی دارم"۔

دوسرے نے فی البدیہہ جواب دیا: "برآید یارب"۔

۱۱۔ مقدمہ سیرالعباد الی المعاد: رضا مایل۔ ص ۱۷-۸۷۔ چاپ تہران

۱۲۔ چودھری محمد حسین: جاوید نامہ پر مضمون: نیرنگِ خیال، اقبال نمبر ۱۹۳۲ء

۱۳۔ Divine Comedy - Inferno-Canto XXVIII

۱۴۔ مشہور مستشرق بوزانی نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اگرچہ دبے لفظوں میں
دانتے اور اقبال از الیساندرو بوزانی۔ ص ۴۳۔ ماہ نو مبر ۱۹۷۷ء طرالف

۱۵۔ چودھری محمد حسین: مضمون جاوید نامہ۔ نیرنگِ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء

۱۶۔ جوہرِ اقبال نمبر ۳۷ اقبالِ کامل: عبدالسلام ندوی: نمبر ۵۵

۱۷۔ علامہ اقبال۔ مقدمۂ اسرارِ خودی

۱۸۔ سیّد محمد عبداللہ: مطالعۂ ادبی کی تاریخ میں اقبال کا مقام: ماہِ نو اقبال نمبر ۱۹۷۷ء

۱۹۔ خطبہ نمبر ۵۔ خطبات اقبال (انگریزی) ص ۱۲۷، سال طباعت ۱۹۷۷ء

نیز دیکھیے نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۲ء

عکسِ جاوید

○

عکسِ جاوید

منظوم اردو ترجمہ

جاوید نامہ

عکسِ جاوید

رہا ہے میرے تخیل میں منظرِ افلاک
رہے ہیں میری نظر میں یہ ماہ و کاہکشاں
گماں نہ کر کہ اسی خاکداں میں دنیا ہے
کہ ہر ستارہ میں دنیا ہے یار ہی ہے وہاں

: زبورِ عجم

مناجات

اس جہانِ رنگ و بُو میں آدمی — مثلِ نے گرمِ فغاں ہے ہر گھڑی[1]
آرزو ہمدم کی تڑپائے اسے — نالۂ پُرسوز سکھلائے اسے
یہ جہاں، یہ گلستانِ آب و گِل — لاکھ دلکش، ہے مگر محرُومِ دل
بھرے گونگے دشت و دریا کوہ و کاہ — بھرے گونگے بحر و برّ و مہر و ماہ
گو فلک پر ہے ستاروں کا ہجوم — اجنبی باہم ہیں یہ سارے نجوم
یہ سبھی اپنی طرح بیچارہ ہیں — وسعتِ افلاک میں آوارہ ہیں
کارواں بے ساز و ساماں ہے رواں — لمبی راتیں اور فضائیں بیکراں
یہ جہاں ہے صید، ہم ہیں صید گیر! — یا جسے صیّاد بھولا وہ اسیر[الف]

الف: ای وای بر اسیری کز یاد رفتہ باشد — در دام ماندہ مرغی، صیاد رفتہ باشد
(حزین لاہیجی)

ای وای بر آن مرغِ گرفتار کہ از وی — صیاد شود غافل و در دام بمیرد
(علی نقی)

بر صیدِ ناتوانی بیداد رفتہ باشد — گر سر نکشتہ او را صیاد رفتہ باشد

(عذری): باقی اگلے صفحہ پر

یہ فضا خاموش ، میں گرمِ فغاں
کوئی ہمدم ابنِ آدم کا کہاں؟

جو کہ ہے روزِ جہانِ چار سُو — نور سے جس کے ہیں روشن کاخ و کُو
گردشِ سیّارہ سے اس کا وجود — یہ فقط ہے اک طلسم رفت و بود

دن وہی ہے جو نہیں ایام سے — جو ہو فارغ ، قیدِ صبح و شام سے
روشن اس کے نور سے ہو جاں اگر — رنگ کی صورت صدا آئے نظر
غیب اس کی روشنی سے ہے حضور — اس کی نوبت لازوال و بے مرور
بخش دے وہ دن تُو مجھ کو اے خدا!

اور اس بے سوز دن سے کر رہا
کس کے حق میں آیتِ تسخیر ہے — کس پہ حیراں آسمانِ پیر ہے
"علّم الاسماء" کا محرم کون تھا — کون مستِ بادۂ عرفاں ہوا

سب جہانوں سے چُنا تُو نے کسے؟ — رازداں اپنا کیا تُو نے کسے؟
اے کہ تُو نے دل مرا گھائل کیا — کس نے "اُدعُونی" کہا، کس سے کہا؟
تیرا چہرہ ہے مجھے قرآن و دیں — سامنے نظروں کے کیوں آتا نہیں؟

الف: گزشتہ سے پیوستہ:

بر آں صیدِ مسکیں چہ بیداد رفت — کہ در دام از یادِ صیاد رفت
(ظہوری)

ماند در زلفِ تو دل "وای بر آں صیدِ اسیر — کہ بدام افتد و از خاطرِ صیاد رود
(حیرتی)

کچھ شعاعوں کا جو ہو جائے زیاں
نور کم سورج کا ہوتا ہے کہاں؟

عصرِ حاضر، عقل کی زنداں میں ہے — مجھ سی بے تابی بھلا کس جاں میں ہے
زندگانی مدتوں تڑپا کرے — جانِ بے تاب ایک، تب پیدا کرے
صاف کہہ دوں، یہ زمینِ شورہ زار — کب ہے تخمِ آرزو کو سازگار
اس زمینِ بے ثمر کے سینے سے — ہے غنیمت، ایک دل بھی گر اُگے
تو ہے چاند! آ جا شبستاں میں مرے — جاں کی بے نوری کو میری دیکھ لے

شعلہ کو خاشاک سے پرہیز کیا!
برق کو گرنے سے کیا خطرہ بھلا!

اب تلک فرقت کے سب صدمے سہے — اب دکھا دے کیا ہے گردوں سے پرے
کھول دے میرے لیے سب بستہ در — راز دانِ قدسیاں مٹی کو کر!
کر دے روشن آگ سے سینہ مرا — عود کو تو چھوڑ، ہیزم کو جلا!
آگ میرے عود کو تو پھر دکھا — اور دھواں پھیلا دے عالم میں مرا
آتشِ پیمانۂ دل تیز کر! — اے تغافل پیشہ کر مجھ پر نظر
دور آنکھوں سے ہے تو جویا ہیں ہم — بلکہ تو ہے پاس، نابینا ہیں ہم
یا اٹھا دے پردۂ اسرار کو — یا اٹھا لے جانِ بے دیدار کو
میرا نخلِ فکر ہے بے برگ و بر — کاٹ ڈال اس کو تو، یا شاداب کر
عقل دی ہے، کچھ جنوں بھی دے مجھے — سوزِ جذبِ اندروں بھی دے مجھے
علم کا گھر خلوتِ افکار میں — عشق کا مسکن دلِ بیدار میں
علم بے عشق و جنوں بیکار ہے — اک تماشا خانۂ افکار ہے
یہ تماشا کیا ہے؟ سحرِ سامری — علم ہے بے وحیِ حق، افسوں گری

ہیزم - لکڑی

بے تجلّی مردِ دانشور سدا — خار زارِ فکر میں الجھا رہا
بے تجلّی زندگی دکھ ہے تمام — جبر دیں کا، عقل مہجوری کا نام[9]
یہ جہانِ کوہ و دشت و بحر و بر — میں نظر مانگوں، وہ دیتا ہے خبر
کر دلِ آوارہ کو منزل عطا — ماہ پارہ ہوں، مہِ کامل بنا
گو ہے میرا کام تخلیقِ کلام — ذکرِ مہجوری نہیں ہوتا تمام
زیرِ گردوں خود کو پاتا ہوں غریب — عرش سے مجھ کو پکار "اتی قریب"[10]
مثلِ مہر و ماہ ہو جائیں غروب — یہ جہاتِ مشرق و غرب و جنوب
یہ طلسمِ دوش و فردا توڑ دوں
چاند تاروں کو میں پیچھے چھوڑ دوں
تو فروغِ جاوداں، ہم ہیں شرار — زندگی اک دم کی، وہ بھی مستعار
جہدِ مرگ و زیست سے تُو بے خبر — رشک کرتا ہوں میں تیری ذات پر
بندۂ آفاق گیر و ناصبور — مضطرب ہے، غیب ہو یا ہو حضور
میں ہوں فانی، کر دے مجھ کو جاوداں — اس زمیں کو تُو بنا دے آسماں
ضبط، گفتار و عمل میں دے مجھے — راستے ہیں، چلنے کی توفیق دے
میرے شعروں کا جہاں ہی اور ہے — اس زمیں کا آسماں ہی اور ہے
میں ہوں پُر آشوب، بحرِ بے کراں — میری گہرائی جو پا لے، وہ کہاں؟
اک جہاں ہے میرے ساحل پر مگر — ہے فقط امواج پر اس کی نظر
کچھ نہیں سنتے یہ پیرانِ کہن — نسلِ نو کے واسطے میرا سخن
ہے جوانوں کے لیے میرا پیام
سہل کر ان کے لیے میرا کلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تمہیدِ آسمانی

آفرینش کے پہلے دن آسمان کی زمین پہ طعنہ زنی!

زندگی کی لذتِ غیب و حضور
بن گئی اصلِ جہانِ نزد و دُور

اس طرح تارِ نفس توڑا گیا
روز و شب کا سلسلہ پیدا ہوا

ہر جگہ جوشِ خودی اس طور ہے
شور ہے مَیں اور ہوں تُو اور ہے

چاند تاروں کو ملا ذوقِ خرام
سو چراغوں سے سجا گردوں کا بام

آسماں پر بے کے آیا آفتاب
خیمۂ زربفتِ چاندی کی طناب

آئی پھر صبحِ نخستیں سامنے
عالمِ نَو اپنے پہلو میں لیے

عالمِ انساں تھا صرف اک خاکداں
جس میں بستی تھیں فقط ویرانیاں

بے سرودِ آبجو تھے کوہسار
دشت تھے بے سایۂ ابرِ بہار

شاخساروں پر نہ طائر نغمہ زن
چوکڑی بھرتے نہ صحرا میں ہرن

بحر و بر اس کے تھے سارے خشک و سرد
ہر طرف چھایا ہوا طوفانِ گرد

تھی بہاروں سے زمیں ناآشنا
سبزہ تھا زیرِ زمیں سویا ہوا

طعنہ گردوں نے زمیں کو یوں دیا
"ہوگا کس کا حال بھی تجھ سا بُرا

اس فضا میں کوئی تجھ ایسا نہیں
مجھ سے روشن ہے تُو اے اندھی زمیں

تو بنے پربت، رہے گی خاک ہی — روشن و پایندہ ہیں افلاک ہی
زندہ رہنا ہے تو کچھ جوہر دکھا — ایسے جینے سے تو مرنا ہے بھلا
طعنۂ گردوں سے بیچاری زمیں — ہو گئی شرمندہ و زار و حزیں

تڑپی خاکِ خستہ دل پیشِ خدا
عرش سے آئی اچانک یہ صدا

تو امیں ہے، خود سے لیکن بے خبر — اپنے باطن پر ذرا تو کر نظر
چاند تاروں سے نہیں روشن جہاں — ہے جہاں کی روشنی تو نورِ جاں
مہر کا محتاج ہے نورِ سحر — نورِ جاں دایم مگر ہے جلوہ گر
نورِ جاں بے جادہ ہے گرمِ سفر — ہے شعاعِ مہر سے سیّار تر
ہو گئی مایوس کیوں تو اس قدر — ہے ترا تن ہی تو نورِ جاں کا گھر
عقلِ انسانی کی زد میں ہے جہاں — عشقِ انسانی کی زد میں لامکاں
فکر اس کا راہ داں بے راہبر — آنکھ[11] ہے جبریل سے بیدار تر
خاک اور پرواز میں مثلِ ملک — راستے کا اک پڑاؤ ہے فلک
وہ ہے گردوں کے دلِ بیتاب میں — جیسے سوزن اطلس و سنجاب میں
دامنِ ہستی کے وہ دھوتا ہے داغ — ہیں نگاہیں اس کی عالم کا چراغ
گرچہ نافرماں ہے اور خونریز ہے[12] — پر زمانے کے لیے مہمیز ہے
دیکھتا ہے جلوہ ہائے کائنات[13] — تاکہ پائے وہ صفاتِ حق میں ذات[14]

جو ہوا عاشق جمالِ ذات کا
وہ ہے حاکم جملہ موجودات کا[15]

—

نغمۂ ملائک[16]

خاکِ آدم نوریوں سے ہو گی افزوں ایک دن
یہ زمیں قسمت سے اس کی ہو گی گردوں ایک دن
پل رہا ہے حادثوں کی گود میں جو اُس کا فکر
وہ حدِ افلاک سے نکلے گا بیروں ایک دن
پوچھتا ہے ہم سے کیا، خود معنیِ آدم میں دیکھ
دل میں جو کھٹکے ہے اب تک ہو گا موزوں ایک دن
ہو گا اب موزوں یہ مضموں پیش پا افتادہ یوں
خود دلِ یزداں کو بھی کر دیگا پُر خوں ایک دن[17]

تمہیدِ زمینی

حضرتِ رومی کی روح ظاہر ہو کر معراج کے اسرار بیان کرتی ہے

کب جنونِ دل سمائے شہر میں
دم سا گھٹتا ہے فضائے شہر میں
ڈھونڈتا ہے عشق دشت و کوہسار
یا لبِ دریائے نا پیدا کنار
جب کوئی محرم نہ یاروں میں ملا
پھر خلوت میں لبِ دریا گیا
وہ لبِ دریا، غروبِ آفتاب
آبِ دریا تھا کہ تھا لعلِ مذاب[18]
دے یہ منظر کور کو ذوقِ نظر
شام کو بھی بخشدے رنگِ سحر

میں تھا اپنے دل سے محوِ گفتگو — آرزو دل میں نظر میں جستجو
میں تھا فانی جاودانی سے تھا دُور — زندہ تھا اور زندگانی سے تھا دُور
میں تھا پیاسا، دور مجھ سے چشمہ سار — گا رہا تھا یہ غزل بے اختیار

کچھ بولیے، ہے قندِ فراواں کی آرزو — چہرہ دکھائیے، ہے گلستاں کی آرزو
اک ہاتھ میں ہو جام اک میں ہو زلفِ یار — مجھ کو ہے ایسے رقصِ دل و جاں کی آرزو
کہتے تھے تم یہ ناز سے، جا ہمکو مت ستا — ہے گفتگو میں بس اسی عنواں کی آرزو
ہاں شوق سے اے عقل، پراگندہ گو تو ہو! — اے دل، ہے نکتہ ہائے پریشاں کی آرزو
یہ آب و نانِ چرخ ہیں اک سیلِ بے وفا — ماہی ہوں اور مجھ کو ہے عمّاں[19] کی آرزو
فرعون کے ستم سے دل و جاں ہوئے ملول — ہے نورِ جیبِ موسیِ عمراں[20] کی آرزو
پھرتا تھا کل چراغ لیے شیخ[21] شہر میں — تھا بھیڑیوں سے تنگ، تھی انساں کی آرزو
ان سست ساتھیوں سے ہوں بیزار یوں کہ ہے — شیرِ خدا و رستمِ دستاں[22] کی آرزو

نایابیوں کے شکوے پہ بولا وہ مجھ سے یوں
نایاب ہے جو، ہے اسی جاناں کی آرزو

(رومی)

بے قرار امواج کو نیند آ گئی — چھپ گیا سورج سیاہی چھا گئی
شب نے جو سورج سے چھینے تھے گہر — بن کے تارے تھے فلک پر جلوہ گر
روحِ رومی[23] نے دیے پر دے اٹھا — اک پہاڑی پر ہوئی جلوہ نما
چہرہ روشن اس کا مثلِ آفتاب — شیب[24] اس کا رونقِ عہدِ شباب
اس کے پیکر میں تھا نورِ سرمدی[25] — وہ سراپا تھا سرورِ سرمدی

[۲۶]

اس کے لب پر سرِ پنہانِ وجود — عقدہ ہائے زیست کی جس سے کشود
ایک روشن آئینہ اس کا سخن — سوزِ دل کے ساتھ اس کے علم و فن
میں نے پوچھا "نیست" کیا ہے "بود" کیا؟ — معنیِ محمود و نامحمود کیا؟
بولا "ہے موجود جو چاہے نمود — یہ نمائش ہے تقاضائے وجود
خود کو خود سے ہے سجانا زندگی — شاہدِ ہستی بنانا زندگی
کی بپا روزِ "الست"[۲۷] اک بزم جب — اپنی ہستی پر شہادت کی طلب
زندہ ہے تو مردہ ہے یا جاں بلب — کر شہادت تین شاہد سے[۲۸] طلب
شاہدِ اوّل ہے خود اپنا شعور — دیکھتا ہے خود کو خود اپنا ہی نور
شاہدِ ثانی ہے غیروں کا شعور — دیکھنے کو اپنے ہے غیروں کا نور
تیسرا شاہد ہے خود نورِ خدا — نورِ ذاتِ حق سے خود کو دیکھنا
آگے گر اس نور کے محکم رہے — حی و قایم مثلِ حق تو بھی بنے
زندگی ہے اپنی ہستی کا شعور — دیکھنا بے پردہ ذاتِ حق کا نور
مردِ مومن کو نہیں کافی صفات — مصطفٰےؐ کو تھی فقط مطلوب ذات
کیا ہے معراج آرزوئے جانِ جاں — روبروئے حسن، دل کا امتحاں
شاہدِ عادل کہ ہے جانِ حیات — اس کی ہے تصدیق سے جاں کو ثبات
سامنے اس کے رہے کون استوار — گر رہے کوئی، وہ ہے کامل عیار
پاس تیرے نور ہے، ضائع نہ کر — کر منور اس سے تو قلب و نظر
خوب ہے یہ، اپنی تابانی بڑھا — سامنے سورج کے خود کو آزما
پیکرِ کہنہ کو اپنے پھر تراش — آزمائش اپنی کر، موجود باش

اک یہی موجود بس محمود ہے
ورنہ نارِ زندگی بھی دُود ہے

کیسے جائیں پیشِ حق، میں نے کہا — کیسے توڑیں آب و گِل کا سلسلہ
حق نہیں ہے پابندِ امر و خلق[29] — وقت کے تیروں سے ہم ہیں خستہ حلق
بولا گر حاصل تجھے "سلطان" ہو — توڑ سکتا ہے حدِ افلاک کو
ٹھہر جا، ہو تا کہ عریاں کائنات — اس کے دامن سے ڈھلے گردِ جہات
ذلت ہیں اس کے نہیں ہے بیش و کم — ہے وہ ہم سے اور خود اس سے ہیں ہم
نکتۂ اِلَّا بِسُلْطَان[30] یاد کر — ورنہ کیڑوں کی طرح مٹی نیں مر
عالمِ خاکی میں یہ آمد رتہی — تھی ولادت کے طریقے سے ہوئی
تو ولادت ہی سے مردِ نیک ذات — توڑ سکتا ہے یہ بندِ شش جہات
یہ ولادت پانی مٹی کی نہیں — جانتا ہے اس کو ہر اہلِ یقیں
جبر اس میں لیکن اُس میں اختیار — وہ ولادت ہے نہاں، یہ آشکار
اِس میں گریہ اور اُس میں خندہ ہے — یعنی وہ جوئندہ، یہ یابندہ ہے
وہ فقط سیرِ درونِ کائنات — یہ ہے لیکن سیرِ بیرونِ جہات
روز و شب کا یہ اگر محتاج ہے — لیکن اُس کا روز و شب پر راج ہے
طفل کی تولید پر ٹوٹے شکم — ٹوٹے عالم، مرد جس دم لے جنم
دونوں کی تولید پر شاہد اذاں — لب کہیں اس کو، اسے کہتی ہے جاں

جانِ روشن جب کرے پیدا بدن
لرزہ بر اندام ہو دیرِ کہن!

میں نے یہ پوچھا کہ ہے تولید کیا؟ — "ایک شانِ زندگی" اس نے کہا
زندگی کے شیوے ہیں غیب و حضور[31] — ہے اگر اِس میں ثبات، اُس میں مرور
جلوتوں میں وہ کبھی ہے خود گداز — خلوتوں میں وہ کبھی ہے خویش ساز
اس کی جلوت میں عیاں نورِ صفات — اس کی خلوت میں ہے روشن نورِ ذات

عقل اس کو سوئے جلوت لے چلے [۳۳]
عشق اس کو سوئے خلوت لے چلے

عقل بھی عالم میں سرگرداں پھرے
تاکہ تسخیرِ عناصر کر سکے

راہ کے پتھر ہوئے اس کے ادیب
اور بنے برق و سحاب اس کے خطیب

گرچہ ہے ذوقِ نظر حاصل اسے
جرأتِ رندانہ لیکن کب رکھے [الف]

راہ کے ڈر سے ہے آہستہ خرام
مثلِ نابینا خرد ہے سست گام

عقل رنگ و بو میں ہے الجھی ہوئی
منزلِ محبوب سے ہے اجنبی

عقل کا تدریج سے بنتا ہے کام
جانے کب منصوبہ اس کا ہو تمام

عشق کچھ جانے نہ سال و ماہ کو
کچھ نہ سمجھے نزد و دورِ راہ کو

عقل کرتی ہے پہاڑوں میں شگاف
یا کیا کرتی ہے گردِ اُن کے طواف

کوہ بھی تو عشق کے آگے ہے کاہ
تیز رفتاری میں دل ہے مثلِ ماہ

لامکاں ہے عشق کے زیرِ نگیں
وہ فنا سے موت سے واقف نہیں

آب و گِل سے عشق کی طاقت نہیں
زورِ تن سے عشق کی قوت نہیں

نانِ جو [۳۴] سے فتحِ خیبر کو کیا
چاند کو دو ٹکڑے اس نے کر دیا

کلۂ نمرود [۳۵] کچلا بے لڑے
لشکرِ فرعون [۳۶] روندا بے لڑے

عشق خاکستر بھی اور اخگر بھی ہے
دانش و ایماں سے وہ برتر بھی ہے

عشق ہے سلطان و برہانِ مبیں
دونوں عالم عشق کے زیرِ نگیں

لازمان و دوش و فردا اس سے ہیں
لامکان و زیر و بالا اس سے ہیں

جب خدا سے ہو طلب گارِ خودی
ہو جہاں پر اس کی قائم سروری

(الف) عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست
لیکن این بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست : زبورِ عجم

آشکار اس سے مقامِ دل تمام — اس سے عالم کی کشش باطل تمام
نذرِ یزداں عاشق اپنی جاں کریں — عقلِ حیلہ گر کو بھی قرباں کریں!
گر ہے عاشق تو بڑھا بے سمت گام — موت کو اپنے لیے کر لے حرام
اے کہ تو ہے مثلِ مردہ زیرِ گور — اٹھ بھی سکتا ہے تو بے آوازِ صور
تو کہ رکھتا ہے نوائے خوب و نغز[27] — کب تلک ٹرّائے گا تو مثلِ چغز[28]
ہیں زمین و آسماں تیرے لیے — ہو رہا وقت و مکاں کی قید سے
تیز تر کر اپنے چشم و گوش کو — رہنما اپنا بنا تو ہوش کو
"جانتا ہے چیونٹی کی جو زباں[الف] — منکشف اُس پہ ہیں اسرارِ جہاں"
مجھ سے لے تو وہ نگاہِ دُوربیں — جو اِن آنکھوں میں سما سکتی نہیں

"آدمی ہے دید، باقی پوست ہے[29]
دید بس وہ ہے جو دیدِ دوست ہے"

"تن کو یوں اپنی نظر میں جذب کر — تن مٹے تیرا رہے باقی نظر
آسمانوں سے تو ڈرتا ہے، نہ ڈر — ان جہانوں سے تو ڈرتا ہے، نہ ڈر
تو ذرا وقت و مکاں پر غور کر — دونوں ہیں احوالِ جاں اے خوش نظر
گر نہ ہو انوارِ حق سے مستنیر — آنکھ ہے پھر دوش و فردا میں اسیر

الف: قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ.
(کہا ایک چیونٹی نے اے چیونٹیو! داخل ہو اپنے گھروں میں نہ کچل ڈالے تم کو سلیمان اور اس کا لشکر اور وہ نہ جانتے ہوں)۔

دانہ جو زیرِ زمیں، رکھتا ہے گھر — ہے فضائے آسماں سے بے خبر
بے خبر اس سے اگر جا ہو فراخ — پھیل سکتا ہے فضا میں شاخ شاخ

اس کا جوہر کیا ہے؟ اک ذوقِ نمو
جس سے اس کی ہستی، اس کی آبرو

تو نے جانا محملِ جاں ہے بدن — سرِّ جاں پر غور کر، مت دیکھ تن
حالِ جاں ہے یہ بدن، محمل نہیں — محملِ جاں، جسمِ آب و گِل نہیں

کیا ہے جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد — ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد
جسم کیا ہے؟ رنگ و بو کا اک نظام — ہے جہانِ چار سو اس کا مقام
اصلِ ادراک، امتیازِ نزد و دور — اور معراج، انقلاب اندر شعور
انقلابِ ذہن لائیں جذب و شوق — جو مٹا دے امتیازِ تحت و فوق

یہ بدن کب جان سے ہمباز ہے
مشتِ گِل، کب مانعِ پرواز ہے

زروان[41]

زروان جو زمان و مکاں کی روح ہے مسافر کو عالمِ علوی کی سیر کراتی ہے

مجھ کو بے تاب اس کی باتوں نے کیا
صورتِ سیماب میرا دل ہوا

دور افق پہ ناگہاں ایسا ہوا
نور کا بادل فلک پہ چھا گیا

اک فرشتہ آیا زیرِ آسماں
اسکے چہرے دو تھے اک آگ، اک دھواں

اک شبِ تاریک، اک روشن شہاب
اِس کی بیدار آنکھ، اُس کی محوِ خواب[42]

رنگ اس کے بازوؤں کا سرخ و زرد
سبز، نیلا، نقرئی اور لاجورد[43]

تیز رفتاری میں وہ مثلِ خیال
پہنچے وہ گردوں پہ بجلی کی مثال

ہر نفس اس کا ہے اک عالم نیا
اس کے اڑنے کو نئی ہر دم فضا[44]

بولا "میں زروان ہوں قاہر ہوں میں
آنکھ سے پوشیدہ ہوں ظاہر ہوں میں[45]

مجھ سے وابستہ ہے ہر تدبیرِ کار
ناطق و صامت ہیں سب میرے شکار

مجھ سے ہے شاخوں پہ غنچوں کی چٹک
باغ میں مجھ سے ہے بلبل کی چہک

دانہ میرے دم سے بنتا ہے نہال[46]
ہجر میرے فیض ہی سے ہے وصال

باعثِ لطف و کرم میرا عتاب
تشنہ کر کے میں پلاتا ہوں شراب

زندگی ہوں، موت ہوں، میں ہوں نشور
میں حساب و دوزخ و فردوس و حور

سارے انسان و ملک میرے غلام
میرے ہاتھوں میں ہے عالم کا نظام

شاخ سے چنتے ہو جو، وہ گُل ہوں میں
اصلِ جزو ہوں اور اصلِ کُل ہوں میں

یہ جہاں ہے میرے افسوں میں اسیر
ہو رہا ہے مجھ سے وہ ہر لحظہ پیر

"لی مع اللہ"[47] جس کے دل میں بس گیا
میرا افسوں کچھ نہ اس پر چل سکا

مجھ سے آزادی کی گر ہے آرزو!
"لی مع اللہ" پڑھ خلوصِ دل سے تُو

تھی نظر اس کی عجب جادو بھری — دور نظروں سے یہ عالم لے گئی
میری نظروں میں تھا یا عالم نیا — یا وہی عالم دگرگوں ہو گیا
چھُپ گیا مجھ سے جہانِ رنگ و بُو — سامنے تھا عالمِ بے ہاؤ ہُو
رشتہ ٹوٹا اِس جہانِ کہنہ سے — اک جہانِ تازہ ہاتھ آیا مجھے
اک جہاں کھو کر ہوئی بے تاب جاں — خاک سے میری اُٹھا تازہ جہاں
تن سُبک تر، جاں ہوئی سیّار تر — دل ہوا بینندہ تر، بیدار تر
تھا نگاہوں میں ملائک کا جہاں
نغمۂ انجم سنا میں نے وہاں

زمزمۂ انجم

عقل ہے حاصلِ حیات، عشق ہے سرِّ کائنات
پیکرِ خاک آ اِدھر، چھوڑ کے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ و مشتری تجھ سے رقیبِ یکدگر
تیری نگاہ کے لیے کشمکشِ تجلّیات
دوست کی رہ میں جلوے ہیں تازہ بتازہ نو بہ نو
صاحبِ شوق کے لیے، ہیچ ہیں ساری کلّیات[۴۸]
"صدق و صفا ہے زندگی، نشو و نما ہے زندگی

دورِ ازل سے تا ابد ، ملکِ خدا ہے زندگی [الف]
شوقِ غزل سرا کو تو ، رخصتِ ہاؤ ہو بھی دے
رند کو محتسب کو پھر ، بادہ سبو سبو بھی دے
شام و عراق و ہند و پارس ، خوگرِ قند ہو گئے
خوگرِ قند کو ذرا ، تلخیِ آرزو بھی دے
جوش میں آئے آبجو ، بحر کے ہو وہ روبرو
لذتِ سیل دے اسے ، موجۂ تند خو بھی دے
مردِ فقیر آگ ہے ، میری و قیصری ہے خس
فال و فرِ ملوک کو ، اک یہی ہے بات بس
دبدبۂ قلندری ، طنطنۂ سکندری
ایک ہے جذبۂ کلیم ، ایک ہے سحرِ سامری
قتل کرے نظر سے وہ ، فوج سے یہ فنا کرے
ایک ہے صلح و آشتی ، ایک ہے جنگ و داوری
دونوں جہاں کشا بھی ہیں ، دونوں دوام خواہ بھی
اِس کی دلیل قاہری ، اُس کی دلیل دلبری

الف : یہ مصرع بیدل کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے ؎

یک دو نفس خیال باز رشتۂ شوق کن دراز
تا ابد از ازل بتاز ملکِ خداست زندگی

ضربِ قلندری سے تو، سدِّ سکندری[الف] مٹا
رسمِ کلیم تازہ کر ، رونقِ سامری مٹا

فلکِ قمر[۴۹]

یہ زمین و آسماں ملکِ خدا — ابنِ آدم کو یہ ورثہ میں ملا
غافلانہ راستے سے مت گذر — محرمانہ ڈال ہر شے پر نظر
اجنبی مت بن ، وطن ہے یہ ترا — تو نہ گھبرا، رعب کچھ اپنا دکھا
سکّہ تیرے حکم کا ، ہر جا رواں — حکم کے بندے ہیں سب تیرے یہاں
سارا عالم ہے بتانِ چشم و گوش — جس کی ہر فرد افتادہ مثلِ دوش
تو طلب کی راہ میں دیوانہ بن — یعنی ابراہیمِ ہر بت خانہ بن
جب زمین و آسماں طے کر چکے — یہ جہاں اور وہ جہاں طے کر چکے
مانگ حق سے سینکڑوں اور آسماں — اور ایسے صد زمان و صد مکاں
رہنا آسودہ لبِ جوئے بہشت — بے نیازِ حرب و ضرب و خوب و زشت
خواہش و کاوش کا ہنگامہ نہ شور — ایسی جنت سے بھلی آغوشِ گور

الف: عام خیال یہ ہے کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ سکندر ہے اور اس نے سدّ یا دیوارِ چین یا جوج ماجوج کو روکنے کے لیے بنائی تھی لیکن محققین کا خیال یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد کوروش اعظم ایران کا بادشاہ ہے جس کا زمانہ ۵۵۰ ق م ہے، وہ ۵۵۰ ق م میں تخت نشین ہوا اور ۵۲۹ ق م میں فوت ہوا۔

روح کی ہے موت، منزل پر قیام
زندہ تر کرتی ہے پروازِ مدام

ہم سفر تاروں کا ہونا خوب ہے — اک گھڑی رکنا، نہ سونا خوب ہے
جب ہوا افلاک پر میں رہ سپر — جو تھا بالا، زیر وہ آیا نظر
چاند سے برتر زمیں آئی نظر — تھا مرا سایہ وہاں بالائے سر
ہو گئے منزل سے ہم نزدیک تر — اور نظر آیا کہستانِ قمر
رومی بولا "چھوڑ دے وہم و گماں — سیکھ لے آداب و رسمِ آسماں
دور ہے گو چاند، پر ہے آشنا — پہلا مسکن ہے ہماری راہ کا

دیدنی ہیں، دیر و زودِ روزگار
اور اس کے غار ہائے کوہسار

وہ سکوت اور کوہسارِ ہولناک — سوزِ دل میں اور بظاہر چاک چاک
"خافطین" و "یلدرم" دیکھے وہاں — آگ جن کے پیٹ میں، منہ میں دھواں
سبزہ و گل سے نہیں وہ آشنا — بے نوائے طائراں ان کی فضا
ابرِ بے نم اور بادِ تند و تیز — خاکِ مردہ سے سدا گرمِ ستیز
وہ جہانِ کہنہ ہے، بے رنگ و صوت — اس جہاں میں زندگانی ہے نہ موت
زندگی کے نام سے واقف نہیں — حادثوں سے پاک ہے وہ سرزمیں

گرچہ ہے چشم و چراغِ آفتاب
اس کے صبح و شام ہیں بے انقلاب

رومی بولا "اٹھ قدم آگے بڑھا — دولتِ بیدار ہرگز مت گنوا
اس کے ظاہر سے ہے باطن خوبتر — غار کے اندر ہے دنیائے دگر
مردِ دانا جو نظر آئے تجھے — وہ منقش ذہن پر تیرے رہے

چشمِ بینا کو ہے ہر شے دیدنی اس پہ اصلیت عیاں ہر چیز کی
جس طرف میں جاؤں تو اس سمت جا بھولجا ہر چیز کو میرے سوا
ہاتھ میرا کھینچ کر آگے بڑھا
غار کے منہ پر مجھے وہ لے گیا

عارفِ ہندی، جو چاند کے ایک غار میں خلوت گزیں تھا اور
جسے اہلِ ہند "جہاں دوست"[۵۲] کہتے ہیں

مثلِ کوران ہاتھ اس کے دوش پہ غار کے اندر ہوا میں رہ سپہر
چاند ظلمت سے تھا اس کی داغ داغ اس میں سورج بھی تھا محتاجِ چراغ
حملہ آور وہم و شک مجھ پر ہوئے میرے عقل و ہوش سب جاتے رہے
راہزن تھے گھات میں بیٹھے ہوئے دل مرا خالی یقین و صدق سے
ہو گئے جلوے نظر میں بے حجاب صبح تھی روشن وہاں بے آفتاب
اس کی ساری وادیاں زنّار بند[۵۳] دیو کے مانند ہر نخلِ بلند
یہ بھی کیا دنیائے خاک و آب ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ نقشِ خواب ہے؟
ہے ہوا میں مثلِ مے، ذوق و سرور سایہ بھی اس خاک پہ ہے عینِ نور
بے جہت، بے آسماں اس کی زمیں اور بے رنگِ شفق، اس کی جبیں
قیدِ ظلمت میں نہ تھا، نور اس جگہ امتیازِ صبح و شام، اس جا نہ تھا
اک شجر کے نیچے تھا جلوہ نما عارفِ ہندوستاں، مردِ خدا
جسم عریاں، بال تھے سر پر بندھے اس کے گرد اک سانپ تھا حلقہ کیے

آدمی اور آب و گل سے پاک تھا　　سارا عالم پیکر اس کے فکر کا
اس کا وقت آزاد، صبح و شام سے　　وہ تھا فارغ گردشِ ایام سے
پوچھا رومی سے "ہے تیرے کون ساتھ؟"
اس کی نظروں سے عیاں جوشِ حیات"

رُومی

"جستجو میں یہ جواں آوارہ ہے　　گو ہے ثابت، فطرتاً سیّارہ ہے
اپنی خامی سے یہ پختہ تر ہوا　　میں ہوا ہوں اس کی خامی پہ فدا
آسماں، اس کے تخیل کی زمیں　　فکر کا اس کے امیں، روح الامیں
ہے کمند افگن، مہ و خورشید پہ　　آسمانوں پر سدا اس کا گذر
جو کہا اس نے وہ رندانہ کہا　　خلد کو اس نے صنم خانہ کہا
شعلہ در آغوش ہے اس کا دھواں　　کبریائی اس کے سجدوں سے عیاں
دردِ دل سے ہر نفس محوِ فغاں　　وصل و فرقت اس کو ہیں، آزارِ جاں
جانے کیا چیز اس کے آب و گِل میں ہے؟
کیا مقام اس کا، وہ کس منزل میں ہے؟

جہاں دوست

حق ہے بے رنگ اور عالم رنگ کا[۵۴]　　کیا ہے عالم؟ کیا ہے آدم؟ حق ہے کیا؟

رُومی

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن　　عالم اس شمشیر کو سنگِ فسن[۵۵]

شرق کی نظریں فقط اللہ پر — عالمِ امکاں پہ مغرب کی نظر
چشم وا کرنا ہے حق پر، بندگی[58] — چشم وا کرنا ہے خود پر، زندگی
جب کوئی پاتا ہے یہ رازِ حیات — بھیجتا ہے خود خدا اس پر صلوٰت

اگر جو تقدیر سے اپنی نہیں
خاک اس کی سوزِ جاں رکھتی نہیں

جہاں دوست

شرق ہے معروف بحثِ ہست و نیست — وہ سمجھ سکتا نہیں اسرارِ زیست
ہم فلک والے سراپا دید ہیں — اس کے مستقبل سے پُر امید ہیں
میں نے کل دیکھا فرازِ قشمرود[57] — آسماں سے اک ملک آیا فرود
ذوقِ دیدار اپنی آنکھوں میں لیے — تک رہا تھا خاکداں کو شوق سے
راز ہم سے مت چھپا، میں نے کہا — کیا ہے دیکھا خاکداں میں، کچھ بتا؟
حسنِ زہرہ[58] پر ہوا ہے دل فدا — چاہِ بابل[59] یا تجھے یاد آ گیا؟
بولا، مشرق میں ہے وقتِ انقلاب — اس کے پہلو میں ہے تازہ آفتاب
سنگِ رہ سے ہوں گے اب پیدا گہر — اس کے یوسف اب بنیں گے راہبر
اس کے سینے میں قیامت ہے بپا — کوہساروں میں پڑا ہے زلزلہ
چھوڑ دے گا وہ مقامِ آزری — ترک کر دے گا وہ رسمِ بُت گری
خود کو اس ملت نے پایندہ کیا — مٹ کے جس نے خود کو پھر زندہ کیا

عرشیوں کو وہ گھڑی صبحِ طرب
ہوتی ہے بیدار کوئی قوم جب

ایک لمحہ پیرِ ہندی چپ رہا — پھر مری آنکھوں میں جھانکا اور کہا
"عقل کی ہیں موت کے اسباب کیا" — "صرف ترکِ فکر ہے" میں نے کہا
اس نے پوچھا "ہے یہ مرگِ قلب کیا" — "صرف ترکِ ذکر ہے" میں نے کہا
اس نے پوچھا "تن ہے کیا؟" میں نے کہا — "تن فقط ذرّہ ہے گردِ راہ کا"
اس نے پوچھا "جاں ہے کیا؟" میں نے کہا — "جاں فقط ہے ایک رمزِ لا الٰہ"
پوچھا "کیا ہے آدمی؟" میں نے کہا — "آدمی عالم میں ہے سرِّ خدا"[۶۰]
اس نے پوچھا مجھ سے "یہ عالم ہے کیا؟" — "ہے وہ خود ہی روبرو"[۶۱] میں نے کہا
پوچھا "علم و فن؟" کہا میں نے کہ "پوست" — پوچھا "حجت؟" بولا میں "ہے دوئے دوست"
دینِ عامی پوچھا، میں بولا "شنید" — دینِ عارف پوچھا، میں بولا کہ "دید"

میری باتوں سے ہوا وہ شادماں
دلنشیں نکتے کیے اس نے بیاں

عارفِ ہندی کے نو نکات

(۱)

ذاتِ حق کوکب یہ عالم ہے حجاب[۶۲]
غوطے میں حائل نہیں ہے نقشِ آب

(۲)

پیدا ہونا عالمِ نو میں بھلا
زندگی پر تا شباب آئے نیا

(۳)

حق ہنے عینِ زندگی مرنے سے پاک
مردہ ان اسرار کو سمجھے گا خاک
گرچہ ہم مجبور ہیں، بے پر ہیں ہم
حق سے علمِ مرگ میں برتر ہیں ہم

(۴)

وقت ہے اک میٹھی گولی زہر کی
لطف میں آمیزش اس کے قہر کی
زحمتِ عالم ہے وہ آتا ہے جب
اور رحمت ہے گذر جاتا ہے جب

(۵)

کافری ہے موت اے روشن نہاد
کیا کرے گا مردہ سے غازی جہاد
مومن اپنی ذات سے یوں پنجہ زن
شیر کے پنجوں میں ہو جیسے ہرن

(۶)

ہو جو مومن خفتۂ و بیمار دل ۶۳
اس سے بہتر کافرِ بیدار دل

(۷)

ہے وہ آنکھ اندھی جو دیکھے ناصواب
روئے شب ہرگز نہ دیکھے آفتاب

(۸)

صحبتِ گِل سے ہوا دانہ درخت[۹۴]
صحبتِ گِل سے ہے انساں تیرہ بخت
دانہ، گِل سے سیکھتا ہے پیچ و تاب
صید کر لے تا شعاعِ آفتاب

(۹)

میں نے پوچھا ایک دن یہ پھول سے
آب و گِل سے رنگ و بو کیسے تُو لے
بولا گُل اے ہوش مندِ نیک نام
برق سے تُو جیسے لیتا ہے پیام
جان ہمکو بخشتے جذبِ این و آں
جذب، ظاہر ہے ترا، اپنا نہاں

جلوۂ سروش[۹۵]

خود ہی پھر چپ مردِ عارف ہو گیا — ہو کے بے خود آنکھ سے غائب ہوا
شوق اس کو لے اڑا سوئے وجود[۹۶] — مٹ گیا افسونِ نیرنگِ شہود
طُور کر دے ذرّے کو اس کا حضور — بے حضور اس کے نہیں نُور و ظہور[۹۷]
اک حسینہ اس طلسمِ شب میں تھی — ماہِ تاباں اس شبِ تاریک کی
گیسوئے پرتاب اس کے تا کمر — روشن اس کے چہرے سے کوہ و قمر
جلوہ ہائے مست میں ڈوبی ہوئی — نغمہ ہائے مست سے چمکی ہوئی

سامنے اس کے تھا فانوسِ خیال ذو فنوں جیسے سپہرِ کہنہ سال
اس میں روشن نقش ہائے رنگ رنگ رہ گیا میں دیکھ کر وہ نقش دنگ
پنجۂ شاہیں میں تھی کنجشکِ زار کر رہا تھا شیرِ آہو کا شکار
میں نے رومی سے کہا "اے رازداں! مجھ سے اس کی کچھ حقیقت کر بیاں"
"یہ حسیں پیکر" یوں رومی نے کہا "پہلے پیدا فکرِ یزداں میں ہوا
چین سے بیٹھا نہ ذوقِ خود نگر آیا ہستی کے شبستاں میں اتر
ہے ہماری طرح وہ غربت نصیب میں بھی تو بھی اور وہ بھی ہے غریب
شان میں جبریل نام اس کا سروش ہوش اڑا دیتا ہے اور دیتا ہے ہوش
اس کی شبنم سے کھلے اپنی کلی اس کا سوزِ دم، دلوں کی زندگی
سوز اسی سے شاعروں کے دل میں ہے چاک اسی سے پردۂ محمل میں ہے
اک جہاں ہے اس کے نغموں میں نہاں کر نوا سے اس کی حاصل سوزِ جاں"

"نوائے سروش"

نادان دیکھ، ہے تری کشتی سراب میں جینا ترا حجاب میں، مرنا حجاب میں
آنکھوں سے دھویا سرمۂ رازی تو میں نے پھر تقدیرِ اُمم کی دیکھی ہے اُمّ الکتاب میں
دشت و جبل پہ کوند تو کشت و چمن پہ کوند کوندے جو برق خود پہ، فنا ہو سحاب میں
مغرب میں لاکھ ڈھونڈا، نہ ایسا کوئی ملا جس کے مقامِ علم، نہ آئیں حساب میں
ذوقِ جہاں کشائی سے ہے قرب کی سبیل چھا جا تو گُل چمن پہ "اے خوشبو گلاب میں"
مانا یہ میں نے فانی ہے زاہد خودی، مگر آتا نہیں نظر تجھے طوفاں حباب میں
یہ صورتِ دلنشیں نہیں مطرب کے ساز سے فریادِ حور، بحر زدہ ہے رباب میں

سیرِ وادیٔ یرغمید

ملائکہ اسے وادیِ طواسین کہتے ہیں

پیرِ رومیؔ مرشدِ عالی مقام — ہے دمِ عیسیٰ صفت جس کا کلام
"شعر جو پُر سوز ہے" اس نے کہا — "سوزِ اللہ ہُو پہ ہے اس کی بِنا
وہ نوا گلشن کرے خاشاک کو — وہ نوا برہم کرے افلاک کو
بنتی ہے حق پر گواہی وہ نوا — بے نوا کو بخشتی شاہی وہ نوا
خون اس سے جسم میں سیّار تر — قلب ہے جبریل سے بیدار تر
حیف وہ شاعر کہ جس کا ہے ہُنر — رہزنِ قلب اور ابلیسِ نظر
شاعرِ ہندی پہ کر یارب کرم — آشنا معنی سے کر اس کا قلم
عشق کو اس نے کیا خنیاگری — اور خلیلوں کو سکھائی آزری
شعر اس کے بے نوائے سوز و درد — اہلِ دل مُردہ کہیں، اس کو نہ مَرد
شعرِ رنگیں جو نوائے دل نہیں — ہے وہ ہذیان اس سے کچھ حاصل نہیں
طبعِ شاعر ہے سراپا جستجو — خالق و پروردگارِ آرزو
قوم کے سینے میں شاعر مثلِ دل — قوم بے شاعر ہے اک انبارِ گِل
سوز و مستی سے جہاں کا ہے وجود — یہ نہ ہو تو نوحہ ہیں شعر و سرود

شعر کا مقصد ہو گر آدم گری
شاعری ہے وارثِ پیغمبری"

مرشدِ رومی سے یہ میں نے کہا — "کچھ مجھے رازِ نبوت بھی بتا!"
بولا "اعصار اس کی مخلوقات ہیں — اور اقوام و ملل آیات ہیں

ناطق اس کے سوزِ دم سے سنگ و خشت — ہم ہیں حاصل اور وہ ہے مثلِ کشت
تن کی دنیا کو بناتی ہے جمیل — فکر کو دیتی ہے بالِ جبرئیل
اس سے رکھے شورشِ جاں کا ثبات — اس کے لب پر نجم و نور و نازعات[۷۲]
اس کے سورج کو نہیں ہرگز زوال — اس کے منکر کو نہیں ہرگز کمال
لطفِ یزداں، صحبتِ احرار ہے — قہرِ یزداں، ضربتِ کرار ہے
لاکھ ہو تو عقلِ کُل اس کو نہ چھوڑ — رشتۂ جسم و جاں کا تو اس سے نہ توڑ
تیز تر طے کر یہ راہِ پرغمید — تاکہ وہ دیکھیں، ہے جس کا شوقِ دید

کندہ ہیں اک سنگ کی دیوار پہ
چار طاسینِ[۷۳] نبوت، دیکھ ادھر!

شوق اپنی راہ جائے بے دلیل[۷۴] — شوق کو حاصل ہے بالِ جبرئیل
دو قدم اس کو ہے راہِ دور بھی — اور قیام اس کو ہے وجہِ خستگی
میں بڑھا مستانہ سوئے پرغمید — سامنے آئی فصیل اس کی پدید
کیا کہوں، کیا ہے وہ پُرعظمت مقام — کرتے ہیں کوکب طواف اس کا مدام
خاکی اس کے نور سے روشن ضمیر — خاک سے اس کی ہوئے، نوری بصیر
حق نے مجھ کو دل دیا، گفتار دی — جستجوئے عالمِ اسرار دی

فاش میں تجھ پر کروں اسرارِ کُل
تجھکو بتلاؤں طواسینِ رسُل[۷۵]

—

طاسین گوتم

رقاصۂ عشوہ فروش کا توبہ کرنا

گوتم [66]

مئے دیرینہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں
پیشِ صاحب نظراں حور و جناں کچھ بھی نہیں

کوہِ محکم جسے سمجھا تو ، وہ ہے کاہِ فنا
کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں کچھ بھی نہیں

دانشِ مشرق و مغرب کے صنم خانوں میں
وہمِ باطل ہے فقط اور وہاں کچھ بھی نہیں

خود پہ کر غور اور اس دشت سے تر بھاں نہ گذر
ایک بس تو ہے وجودِ دو جہاں کچھ بھی نہیں

میں نے جس راہ کو پلکوں سے چنا ہے اس میں
منزل و قافلہ و ریگِ رواں کچھ بھی نہیں

غیب کو چھوڑ کہ جز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
رہ کے دنیا میں ہو گر ترکِ جہاں ، چیز ہے کچھ

جو تجھے بخشے خدا خلد اسے ، ہیچ سمجھ
ہو اگر اجرِ عمل ، خلدِ جناں ، چیز ہے کچھ

راحتِ جاں کی طلب ہے تو نہیں اس کا وجود
دوست کے غم میں ہو گر اشک رواں ، چیز ہے کچھ

چشمِ مخمور و نگاہِ غلط انداز و سرود
سب بہت خوب مگر خوشتر ازاں، چیز ہے کچھ
حسنِ رخسار ہے گر آج تو کل ہے معدوم
حسنِ افکار و عمل ہی مری جاں، چیز ہے کچھ

رقاصہ

فرصتِ کش مکش نہ دے اس دلِ بیقرار کو
کچھ ذرا اور دے شکن گیسوئے تابدار کو
تیری ہیں وہ تجلیاں دل میں مرے کہ مہر و مہ
سہتے ہیں جن کے واسطے تلخیِ انتظار کو
ذوقِ حضور و دید نے رسمِ صنم گری رکھی
عشق بس اک فریب ہے جانِ امیدوار کو
تاکہ فراغ طبع سے نغمۂ تازہ چھیڑوں میں
طائرِ مرغزار دے پھر اسی مرغزار کو
طبعِ بلند بخشی ہے، کھول دے بندِ پا کو بھی
کملی کے بدلے دوں تجھے، خلعتِ شہریار کو
تیشے سے سنگ توڑنا، یہ بھی ہے کوئی بات کیا!
صاحبِ عشق اٹھا سکے، دوش پہ کوہسار کو

طاسینِ زرتشت[78]

اہرمن[79] کا زرتشت کی آزمائش کرنا

اہرمن

تجھ سے نالاں میری مخلوقات ہیں — تلخ تر تجھ سے مرے اوقات ہیں
تجھ سے عالم میں ہوں میں خوار و زبوں — تیرے رنگیں نقش میں ہے میرا خوں

حق نما ہے جلوۂ سینا ترا
ہے فنا میری ، یدِ بیضا ترا

عہدِ حق پر ہے بھروسہ ابلہی — اس کے کہنے پر ہے چلنا گمرہی
زہرِ قاتل ، اس کی صہبائے زبیب[80] — اس کے انعام ارّہ و کرم صلیب[81]
جز دعا کی نوحؑ نے تدبیر کیا؟ — وعظ میں اس کے تھی کچھ تاثیر کیا!
جا کے تو غاروں میں ہو گوشہ نشیں — اور ملایک کے جہاں میں ہو مکیں
نالہ ہائے دل سے گردوں کو جلا — اور نظر سے خاک کو کر کیمیا
کوہ میں مثلِ کلیم آوارہ بن — نیم سوزِ آتشِ نظارہ بن
لیکن اس پیغمبری کو چھوڑ دے — یعنی اس ملّاگری کو چھوڑ دے
ناکسوں میں ، آدمی ناکس بنے — شعلہ بھی طبعاً اگر ہو ، خس بنے
ہے نبوت[الف] سے ولایت خوب تر — عشق کو پیغمبری ہے دردِ سر

جا کہیں کاشانۂ وحدت میں بیٹھ
چھوڑ کر جلوت کو تو خلوت میں بیٹھ

الف : صوفیا کا مشہور قول ہے کہ الولایت افضل من النبوت

زرتشت

نور، دریا، ساحل اس کا تیرگی   سیلِ تند اس میں نہیں مجھ سا کوئی
میرے دل میں موجہائے بے قرار   غارتِ ساحل ہے، بس میرا شعار
نقشِ بیرنگی کہ رنگِ دین ہے   اہرمن کے خون سے رنگین ہے

ہے خودی کو جگمگانا زندگی
ضرب اپنی آزمانا زندگی

ابتلا سے پختہ ہوتی ہے خودی   رازِ حق کرتی ہے تب ہی فاش بھی
مردِ حق کی صرف حق پہ ہے نظر   لا الٰہ کہتے ہوئے دیتا ہے سر
جان دینا عشق کی ہے آبرو   چوبِ دارہ عشق کی ہے آرزو

راہِ حق میں جو بھی پیش آئے، بجا!
دوست کا ہو قہر، کہیے مرحبا!

جلوۂ حق، چاہوں کب تنہا بھلا   جلوۂ حسن انجمن میں دے مزا
کیا ہے خلوت، درد و سوز و آرزو   انجمن ہے دید، خلوت جستجو
عشق خلوت میں کلیم اللہ ہے   آئے جب جلوت میں شاہنشاہ ہے
خلوت و جلوت، کمالِ سوز و ساز   دونوں حالات و مقاماتِ نیاز
کیا ہے وہ؟ ترکِ کنشت و ترکِ دیر   اور سب کے ساتھ یہ جنت کی سیر
خلوت و جلوت میں گرچہ ہے خدا   وہ ہے گم آغاز، یہ ہے انتہا
دردِ سر پیغمبری کو تو کہے   عشق ہو کامل، تو آدم گر بنے

راہِ حق پر خوب ہے چلنا مگر
کارواں کے ساتھ چلنا خوب تر

طاسینِ مسیح

رؤیائے حکیم طالسطائیؒ

در میانِ کوہسارِ ہفت مرگ
ایک وادی ہے، جو ہے بے شاخ و برگ

چاندنی اس کے دھوئیں میں مثلِ قیر
آفتاب اس کی فضا میں تشنہ میر

اس میں ہے سیماب کا دریا رواں
جس کے پیچ و خم ہیں مثلِ کہکشاں

اس کے آگے سب بلند و پست ہیچ
تند سیر و موج و موج و پیچ پیچ

اک جواں ہے غرق اس میں تا کمر
لب پہ اس کے نالہ ہائے بے اثر

تشنہ اور محروم ہے وہ آب سے
کچھ نہیں اس جا بجز سیماب کے

اک کنارے پر تھی اک نازک بدن
آنکھ جس کی تھی دلوں کی راہزن

کفر سیکھیں اس سے پیرانِ گُشت
زشت خوب اس کی نظر میں خوب زشت

میں نے پوچھا کون ہے تو، کیا ہے نام؟
یہ جواں نالہ بلب کیوں ہے مدام؟

"ساحری" اس نے کہا "میرا ہے کام
مجھ فسونگر کا ہے افرنگیں نام

جم گئی وہ جوئے سیمیں ناگہاں
ٹوٹیں اس کے جسم کی سب ہڈیاں

شکوۂ تقدیر وہ کرنے لگا
آہِ بے تاثیر وہ بھرنے لگا

بولی افرنگیں، ہے تجھ میں عقل اگر
ڈال تو اعمال پر اپنے نظر

ابنِ مریم وہ چراغِ کائنات
نور اس کا باجہات و بے جہات

وہ فلاطوس[1] اور صلیب اور روئے زرد
کیا کیا تھا اس نے اور تو نے اے مرد

---

۱ ـ رومی حاکم جس کے زمانے میں حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کرنے کا حکم ہوا۔

اے پرستارِ بتانِ سیم خام　　تیرے دل پر، لذتِ ایماں حرام
تو رہا روح القدس سے بے خبر
تن خریدا تو نے جاں کو بیچ کر

طعنے افسونگینِ جلوہ مست کے　　اس جواں کے دل میں نشتر سے لگے
بولا "اے گندم نما و جو فروش　　تجھ سے شیخ و برہمن ملت فروش
عقل و دیں ہیں کافری سے تیری خوار　　عشق ہے سوداگری سے تیری خوار
دوستی تیری ہے آزارِ بتاں　　دشمنی تیری ہے مرگِ ناگہاں
آب و گل سے دوستی تیری سدا　　بندے کو تو نے کیا حق سے جدا
عقل جو ہے عقدۂ اشیا کشا　　تو نے اس سے فکرِ چنگیزی لیا
جانتا ہے جو کہ ہے حق آشنا　　جرم تو نے مجھ سے بھی سنگیں کیا
اس کے دم سے مُردے بھی زندہ ہوئے　　جسم تجھ سے جان کے مدفن بنے
اس کے تن پر جو ستم ہم سے ہوا　　روح پر اس کی وہی تم نے کیا
ہے سحر اہلِ جہاں کی تیری شام
تجھ سے لے گا یہ زمانہ انتقام

طاسینِ محمدؐ

حرمِ کعبہ میں روحِ ابوجہل ماتم کرتی ہے!

مصطفیٰؐ سے اپنا سینہ داغ داغ　　گُل کیا ہے اس نے کعبے کا چراغ
دے کے مژدہ فتحِ روم و شام کا　　اس نے باغی نوجوانوں کو کیا

اس کی باتیں ہیں سراسر ساحری | لا الٰہ کہنا بھی ہے خود کافری
دینِ آبا کو مٹا کر رکھ دیا | اس کی ٹھوکر میں ہارے سب خدا
ٹوٹے اس کی ضرب سے لات و منات[89] | اس سے لے تو انتقام اے کائنات!

جو ہے غائب اس کا وہ معبود ہے | اور وہ باطل ہے جو موجود ہے
آنکھ غائب پہ لگانا ہے غلط | آنکھ سے جو کچھ نہ دیکھا، ہے غلط
سجدہ غائب کو حماقت ہے تمام | مذہب تو بے بصیرت ہے تمام

کیوں جھکیں پیشِ خدائے بے جہات
بندہ کو کیا لطف بخشے یہ صلوٰۃ

اس کا مذہب قاطعِ ملک و نسب | ہے عرب، پر منکرِ فضلِ عرب
ایک ہیں اس کے لیے بالا و پست | خود غلاموں سے رہی اس کی نشست
وہ نہ سمجھا قدرِ احرارِ عرب | ایک ہیں اس کے لیے انسان سب
یوں تمیزِ احمر[90] و اسود اٹھی | آبروئے خانداں، جاتی رہی
ہیں مساوات و اخوت اعجمی | جانتا ہوں ہے یہ سلماںؓ[91] مزدکی[92]
اس کی باتوں میں محمدؐ آ گیا | ہے عرب میں ایک ہنگامہ بپا
عزتِ[93] ہاشم کو جانے کیا ہوا | بے بصر دو رکعتوں نے کر دیا
اعجمی کو اصلِ عدنانی[94] کہاں؟ | گونگے کو گفتارِ سحبانی[95] کہاں!
ہو گیا سارا عرب بے آسرا | خاک سے اٹھ اے زہیرِ[96] خوش نوا

اس اندھیرے میں تو بن روشن دلیل
توڑ افسونِ نوائے جبرئیل

کچھ بتا اے سنگِ اسود کچھ بتا! | جو محمدؐ نے ستم ہم پر کیے
اے ہبل[97]! اے گمرہوں کے راہبر | چھین ان بے مذہبوں سے اپنا گھر

ان کی بھیڑیں بھیڑیوں کی نذر کر — تلخ کر ان کی کھجوریں نخل پر
بھیج طوفانِ ہوائے بادیہ — اِنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَة[97]
اے منات اے لات منزل سے نہ جاؤ — گر ہے جانا ہی تمہیں، دل سے نہ جاؤ
میری آنکھیں آپ کا اپنا ہے گھر
گر ہے جانا ہی، تو جانا ٹھہر کر!

فلکِ عطارد[98الف]

جمال الدین افغانی[98ب] اور سعید حلیم پاشا[99] کی ارواح کی زیارت!

مشتِ خاک اڑتی ہوئی آگے بڑھی — خود تماشائے خودی کرتی ہوئی
ہو گیا ہوں صیدِ دامِ ہست و بود — دام میں یا میرے آیا ہے وجود؟
دامنِ گردوں ہے مجھ سے چاک چاک — ہوں فلک سے، یا فلک ہے میری خاک؟
یا مرے دل کو فلک نے پا لیا — یا مرے دل نے فلک کو جا لیا
ہے بظاہر یا بباطن! ہے یہ کیا؟ — کیا ہے آخر، دیکھتی ہے جو نگاہ
اک نئے گردوں پہ ہوں میں پرگشا — سامنے ہے میرے اک عالم نیا
اس جہاں میں بھی ہیں دشت و بحر و بر — ہے زمیں سے یہ جہاں دیرینہ تر
ابر کے ٹکڑے سے ہے اس کا ظہور — دستبردِ آدمی سے ہے یہ دور
لوحِ ہستی نقش سے ہے پاک ابھی — ناقدِ فطرت نہیں اس جا کوئی

بولا میں رومی سے "یہ صحرا ہے خوب — اور اس میں شورشِ دریا ہے خوب

Library
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

زندگانی کا نہیں اس جا نشاں — پھر کہاں سے آئی آوازِ اذاں؟
"خاکداں ہے یہ جہانِ اولیا" — مرشدِ رومی نے یہ مجھ سے کہا
"نکلے حضرت بوالبشر جب خلد سے — ایک دو روز اس جہاں میں بھی رہے
اس فضا نے دیکھا ان کا سوزِ آہ — اور دردِ نالہ ہائے صبحگاہ
اس کے زائر رکھتے ہیں اعلیٰ مقام — اس کے زائر پاک طینت نیک نام
اولیا، جیسے فضیلؒ و بوسعیدؒ — صوفیا، جیسے جنیدؒ و بایزیدؒ

جلد چل آگے کہ مل جائے نماز
ہمکو بھی حاصل ہو کچھ سوز و گداز

دو نمازی دیکھے مصروفِ قیام — مقتدی تاتاری، افغانی امام
ہر گھڑی رومی کو حاصل ہے حضور — اس کے چہرے پر عیاں ذوق و سرور
"ان سے بہتر آدمی" اس نے کہا — "ارضِ مشرق نے نہیں پیدا کیا
سیدالسادات مولانا جمال — زندہ جس کے قول سے سنگ و سفال
ترک پاشا وہ حلیمِ دردمند — فکر اس کا اور مقام اس کا بلند

ساتھ ایسوں کے دو رکعت بندگی
ورنہ مزدوری عوض میں خلد کی

قرأتِ پُر سوز، مردِ سخت کوش — سورۂ والنجمؑ، وہ دشتِ خموش
ایسی قرأتؑ مست ہو جس سے خلیلؑ — وجد میں آ جائے جس سے جبرئیل
جس سے صبر و ضبطِ دل جاتا رہے — شورِ الا اللہ قبروں سے اٹھے
اضطرابِ شعلہ دے جو دود کو — سوز و مستی بخشے جو داؤدؑ کو

اس کی قرأت سے ہویدا ہر غیاب
اس سے روشن معنیِ اُم الکتاب

اپنی جا سے میں اٹھا بعد از نماز   ہاتھ اس کے چومے از راہِ نیاز
یہ کہا رومی نے "یہ گردوں نورد   دل میں رکھتا ہے جہانِ سوز و درد
ہے یہ مردِ خود شناس و خود نگر   اجنبی اپنوں میں ہے یہ دیدہ ور
ہے یہ محوِ سیرِ دنیائے وجود
میں نے اس کا نام رکھا" زندہ رُود"

افغانی

زندہ رُود اے خاکیِ قدسی نشاں[105]   کیسے ہیں اپنے زمین و آسماں
حال بتلا ملتِ اسلام کا   حال کہہ مشرق کے صبح و شام کا

زندہ رُود

ملتِ مسلم کہ تھی گیتی شکن[106]   رکھتی ہے آویزشِ دین و وطن[107]
تن ہے زندہ روح لیکن مر چکی   کام بے دینی یوں اپنا کر چکی
ترک و ایران و عرب، مستِ فرنگ   ہے سبھی کے حلق میں شستِ فرنگ
شاہیِ مغرب کا ہے مشرق شکار   دیں ہوا ہے اشتراکیت سے خوار

افغانی

دین و وطن

شاطرِ مغرب وہ مردِ مکر و فن   جس نے مسلم کو دیا درسِ وطن

اس میں فکرِ مرکز اور تم میں نفاق
چھوڑ دو شام و فلسطین و عراق

ہے اگر تم کو تمیزِ خوب و زشت
توڑ ڈالو یہ بتانِ سنگ و خشت

دین کیا ہے! خاک سے ہونا بلند
تاکہ جانے خود کو جانِ ارجمند

جو خلوصِ دل سے اللہ ھُو کہے
اس نظامِ چار سو میں کب رہے

خاک سے اگتا ہے تنکا خاک ہے
خاک لیکن کب یہ جانِ پاک ہے

آب و گل سے گرچہ خود انساں بنا
آب و گل سے رنگ و روپ اس نے لیا

حیف ہے گر آب و گل ہی میں رہے
حیف ہے اس سے نہ اوپر گر اٹھے

حکم تن ہے، بن تو خاکِ رہگذر
حکمِ جاں، رکھ آسمانوں پر نظر

شش جہت میں جاں سما سکتی نہیں
مردِ حر ہے قید سے واقف کہیں

مردِ حر ہے خاک سے محوِ خروش
ہو بھلا شہباز سے کب کارِ موش

مٹھی بھر مٹی ہے، نام اس کا وطن
کہتے ہو تم مصر و ایران و یمن

ہے وطن سے نسبتِ اہلِ وطن
ہے وطن گلہائے ملت کا چمن

ڈالو اس نسبت پہ گر تم اک نظر
نکتہ باؤ بال سے باریک تر

جانبِ مشرق سے ہر صبح آفتاب
اپنے چہرے سے ہٹاتا ہے حجاب

یہ تب و تاب اس کی ہے سب اسلیے
تاکہ نکلے قیدِ شرق و غرب سے

شرق سے ہوتا ہے جب وہ جلوہ گر
ضو فشاں ہوتا ہے کُل آفاق پر

مشرق و مغرب سے لیکن ہے بری
گرچہ ہے نسبت کی رُو سے خاوری

—

اشتراکیت[۱۰۸ الف] و ملوکیت[۱۰۸ ب]

[۱۰۹] صاحبِ سرمایہ[ا] وہ پورِ خلیل[ب] یعنی وہ پیغمبرِ بے جبرئیل!
حق و باطل دونوں وہ مضمر رکھے دل سے مومن ہے وہ کافر ذہن سے
غرب ہے شیدائیِ دنیائے خاک وہ شکم میں ڈھونڈتا ہے جانِ پاک
جسم سے کب فیض پائے جانِ پاک تن سے رکھتا ہے سروکار اشتراک
منکرِ ذاتِ خدا ہے وہ رسول! ہے مساواتِ شکم اس کا اصول

ہے اخوت کا اگر دل میں مقام
کب بھلا رکھتی ہے وہ رگِ گل میں قیام

ہے ملوکیت بدن کی فربہی اس کا سینہ نورِ دل سے ہے تہی
برگِ گل کو چھوڑ کر جیسے مگس چوستی ہے پھول سے بس اس کا رس
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل وہی حسنِ گل پر نالۂ بلبل وہی
ایک افسوں ہے یہ رنگ و بو مگر چھوڑ صورت، ڈال معنی پر نظر

دیکھنا دشوار ہے گو مرگِ دل
گُل نہیں ہے یہ حقیقت میں ہے گِل

ا۔ کارل مارکس، مصنف کتاب "سرمایہ" (داس کیپیٹل)۔ اس میں اشتراکیت کے اصول بیان کیے ہیں۔

ب۔ کارل مارکس یہودی تھا، اس کی طرف اشارہ ہے۔

اشتراک و شاہی، دونوں ناشکیب — دونوں یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی اِس کو خروج[10] اُس کو خراج[11] — آدم ان دو پتھروں میں ہے زجاج[12]
علم و دین و فن کو یہ غارت کرے — چھینے وہ جاں تن سے روٹی ہاتھ سے
دونوں کو پایا ہے غرقِ آب و گل — دونوں ہیں روشن تن و تاریک دل

زندگی کیا ہے؟ سراپا سوز و ساز
بخشنا پتھر کو بھی دل کا گداز

سعید حلیم پاشا

شرق و غرب

غربیوں کو عقل ہے سازِ حیات — شرقیوں کو عشق، رازِ کائنات
عشق سے ہے عقلِ انساں حق شناس — عقل سے ہے عشق کی محکم اساس
جب ملیں عشق و خرد دونوں بہم — اک نئے عالم کو دیتے ہیں جنم
اٹھ جہانِ تازہ کو تعمیر کر — عشق و دانش کو ملا باہم دگر
شعلۂ افرنگیانم خوردہ ہے — چشم ہے بینا مگر دل مُردہ ہے
اپنی ہی شمشیر سے زخمی ہوئے — وہ خود اپنے دام ہی میں آگئے
سوز و مستی ان کی صہبا میں نہیں — عصرِ تازہ ان کی دنیا میں نہیں
سوز و سازِ زیست ہے تیرا شرر — اک جہانِ تازہ کو تخلیق کر
مصطفیٰ[13] قائد تھا جو تجدید کا — "دھو دو ہر نقشِ کہن" اس نے کہا

---

[10] مصطفیٰ کمال پاشا

کب نیا ہو کعبے کا رختِ حیات — لائیں لاکھ افرنگ سے لات و منات
بے نوائے تازہ اس کی چنگ ہے — اس کا تازہ کہنۂ افرنگ ہے
دم تو اس میں تھا، پہ تازہ دم نہ تھا — ذہن میں اس کے نیا عالم نہ تھا
اس جہاں پر ہی قناعت کر گیا — دو قدم آگے نہ لیکن بڑھ سکا
ہے عجب لیکن مزاجِ کائنات — زندگی تقلید سے ہے بے ثبات
مردِ مومن خالقِ اعصار ہے — اس کی جاں تقلید سے بیزار ہے
گر ہے تیرے پاس مومن کی نظر — معنیِ قرآن و دل پر غور کر
اس کی اِک آیت میں سو تازہ جہاں — اس کے اک لمحے میں، سو صدیاں نہاں
عصرِ نو کو کافی اس کا اک جہاں — اس کو حاصل کر اگر دل ہے جواں
ہے مسلماں آیتِ شانِ خدا — اس کے تن پر ہر جہاں مثلِ قبا

جونہی ہوتا ہے کہن اس کا جہاں
اس کو قرآں دیتا ہے تازہ جہاں

زندہ رود

ہے ہمارا کارواں بے پاسباں
عالمِ قرآں ہے کیا جانے کہاں؟

افغانی

وہ جہاں دل میں ہمارے گُم ہنوز — اس جہاں کو انتظارِ قُم ہنوز
وہ جہاں، بے امتیازِ خون و رنگ — اس کی شب، روشن تراز روزِ فرنگ
بے غلام و بادشا ہے وہ جہاں — صورتِ قلبِ مسلماں بے کراں

عالمِ رعنا بہ فیضِ یک نظر — ہو گیا جانِ عمرؓ میں جلوہ گر
جاوداں ہے اس کا لطفِ واردات — نو بہ نو ہیں برگ و بارِ محکمات
اس کا باطن ہر تغیّر سے بری — اس کے ظاہر کو تغیّر ہر گھڑی

تیرے دل میں ہے وہ عالم کر نظر
دیتا ہوں اس کے اصولوں کی خبر

محکماتِ عالمِ قرآنی

۱۔ خلافتِ آدم

دو جہاں میں عشق کے آثار ہیں — آدمی میں عشق کے اسرار ہیں
سرِّ عشق آزاد[۱۱۵] سام و حام سے — کب ہے نسبت اس کو روم و شام سے
اس کا کوکب بے مدار و بے غروب — اس کا عالم بے شمال و بے جنوب
اس کی ہے تقدیر انّی جاعل[۱۱۶] — اس کی ہے تفسیر کُل دنیائے کُن[۱۱۷]
مرگ و قبر و حشر و نشر احوال ہیں — نور و نارِ آخرت اعمال ہیں
وہ امام اور وہ صلوٰۃ اور وہ حرم — وہ سیاہی وہ کتاب اور وہ قلم
رفتہ رفتہ غیب ہوتا ہے حضور — ملک اس کا بے حدِ نزدیک و دور
اس کی ہستی اعتبارِ کائنات — اعتدال اس کا عیارِ ممکنات
اس کا دل ہے ایک بحرِ بے کنار — غرق جس میں ہیں زمانے صد ہزار
محو جو آدم میں ہو، عالم ہے وہ — جو نہ ہو عالم میں محو، آدم ہے وہ

اس کی جلوت سے جمالِ مہر و ماہ　　اس کی خلوت میں ملک پائیں نہ راہ

عرش سے برتر مقامِ آدمی
اصلِ تہذیب، احترامِ آدمی

جانتا ہے، کیا ہے اصلِ زندگی　　عشقِ یک بیں اور تماشائے دوئی
مرد و زن دونوں بہم دمساز ہیں　　کائناتِ شوق کے ہمراز ہیں
زن جہاں میں ہے نگہدارِ حیات　　فطرتِ زن، لوحِ اسرارِ حیات
وہ ہماری آگ میں خود ہی جلے　　اس کا جوہر خاک کو انساں کرے
اس کے دل میں ممکناتِ زندگی　　اس کا تاب و تب ثباتِ زندگی
شعلہ ہے، جس سے فروزاں ہے شرر　　ثبت جس کے سوز سے نقشِ بشر
اس کی عظمت سے ہمیں عظمت ملی　　اس کی تربیّت سے شخصیّت ملی

تجھ کو حاصل ہے اگر سچی نظر
پاک بن اس کا تقدس دیکھ کر

عصرِ نو نے چھینی تیرے دیں کی تاب　　تجھ سے کہتا ہوں میں اسرارِ حجاب
ذوقِ تخلیق آتشِ جان و بدن　　ہے فروغ اس کا، فروغِ انجمن
جس کو اس آتش سے کچھ حصہ ملا　　وہ رقیبِ سوز و سازِ خود ہوا
نقش پر اپنے وہ رکھتا ہے نظر　　تاکہ لوحِ اس کی نہ لے نقشِ دگر
تھے حرا میں مصطفیٰؐ خلوت گزیں　　مدّتوں اس میں رہے تنہا مکیں
ان کی خلوت سے ملی ہمکو نمود　　ملّتِ اسلام نے پایا وجود
کرنا انکارِ خدا ممکن سہی　　پر نہیں امکانِ انکارِ نبی
جان روشن لاکھ ہو مثلِ کلیم　　ہیں ترے افکار بے خلوت عقیم

خلوتوں سے ہے تخیل زندہ تر
زندہ تر، جوینده تر، یابنده تر

شوق و حکمت ہیں مقاماتِ حیات
ہیں مگر دونوں، رہینِ واردات

علم کو لذت ملے تحقیق سے
عشق کو لذت ملے تخلیق سے

صاحبِ تحقیق کو جلوت عزیز
صاحبِ تخلیق کو خلوت عزیز

دیدِ[۱۱۸] کی موسیٰ نے کی تھی التجا
تھا تقاضا لذتِ تحقیق کا

"لن ترانی" میں ہیں کچھ نکتے دقیق
پا سکے ان کو فقط فکرِ عمیق

جس جگہ پیدا ہیں آثارِ حیات
ان کا مرکز ہے ضمیرِ کائنات

دیکھ اس ہنگامۂ آفاق کو
زحمتِ جلوہ نہ دے خلّاق کو

حافظِ نقش آفریں، خلوت ہے بس
اس انگوٹھی کا نگیں، خلوت ہے بس

۲۔ حکومتِ الٰہی

بندۂ حق، بے نیازِ ہر مقام
وہ نہ آقا اور نہ بنتا ہے غلام

بندۂ مولا ہے مردِ حُر فقط
ہیں خداداد اس کے ملک و سلطنت

ہے فقط آئینِ حق اس کا نظام
حق سے ہے اس کا حلال اس کا حرام

عقل کو ہے کام اپنے سود سے
وہ ہے غافل غیر کی بہبود سے

وحی کی نظروں میں ہے سودِ جہاں
وحی کا مقصد ہے بہبودِ جہاں

وہ ہے عادل صلح ہو یا ہو مصاف
عدل اس کا "لایراعی لا یخاف"[۱۱۹]

غیرِ حق، جب ناہی و آمر بنے[۱۲۰]
زور ور کمزور پر قاہر بنے

آمریت اصل میں ہے قاہری
غیرِ حق کی آمریت کافری

قاہرِ چالاک آہنی حصار　　گرد کر لیتا ہے اپنے استوار
یوں وہ شاہیں، تیز چنگ و زود گیر　　صعوہ کو اپنا بناتا ہے مشیر
جبر کو آئین کا وہ نام دے　　سرمہ اندھوں کو عطا اندھا کرے

ہے یہی آئین و رسمِ شہریار
دِہ خدا فربہ ہو، لاغر کاشت کار

ہائے یہ دستورِ مغرب کا اثر　　مردہ اس کے صور سے ہو مردہ تر
مثلِ گردوں مکرباز و حیلہ گر　　قومیں مثلِ نرد آں کے تختہ پر
ایک مزدور ایک ہے سرمایہ دار　　کرتے ہیں اک دوسرے پر دونوں وار
صاف ہی کہہ دوں میں تجھ سے بات اب　　مال ہم ان کے یہ سوداگر ہیں سب
آنکھ بے نم اور دل میں حبِّ زر　　بوجھ ہے ماں کے لیے لختِ جگر
حیف وہ ملّت جو پھل کے خون سے　　نم کو اندامِ شجر سے کھینچ لے
چھیڑتا ہے تار، زخمہ بے سرود　　زیست کو کرتے ہیں محرومِ وجود
شیوے ہیں افرنگ کے اس رنگ کے　　میں فقط عبرت ہی لوں، افرنگ سے

خود کو تو تقلیدِ مغرب سے بچا
رہنما قرآن کو اپنا بنا

۳۔ زمین خدا کی ملکیت ہے!

سرگزشتِ آدمی اتنی سی ہے　　فتنہ ہائے جنگ مٹی کے لیے
ایک دلہن اس کے شوہر ہیں ہزار　　سب سے اس بدعہد کے عہد و قرار

ہے سراپا مگر اس کی ہر ادا — ہر کوئی لیکن، تنکار اس کا سوا
بن سکیں کب تیرے یہ سنگ و حجر — تو سفر میں، یہ ہیں اسبابِ حضر[121]
کیا تعلق خفتہ کو بیدار سے — واسطہ ثابت کو کیا سیّار سے[122]
"مالِ آدم ہے زمیں" حق نے کہا[123] — مفت پائی یہ متاعِ بے بہا
وہ خدایا نکتہ یہ تو مجھ سے سُن — رزق و گور اس سے تو لے اس کو نہ چُن
کب اکٹھے ہو سکیں بود و نبود — تو وجود اور وہ نمودِ بے وجود
تو ہے شاہیں تیرا مسکن آسماں — خاک کا تودہ، تری منزل کہاں

معنیِ "الارض للّٰہ"[124] ہے عیاں!
جو نہ دیکھے یہ عیاں، مومن کہاں!

چھوڑ مت تو یہ جہانِ کاخ و کو — تیری دولت ہے جہانِ رنگ و بُو
چھین لے ہر گوہر کو اس کی خاک سے — آسماں کے صید ہیں سارے تر ے
اپنا تیشہ کوہساروں پر چلا — ہر خزانہ بحر و بر کا ہے ترا!
آزری[125] کی رسم دنیا سے مٹا — اپنی مرضی سے نئی دنیا بنا
دل جہانِ رنگ و بو میں مت لگا — دل حریمِ حق ہے دل میں حق بسا
گویا وہ مرنا ہے بے گور و کفن — ہونا محوِ نقرہؑ و فرزند و زن
کرے جو بھی لا الٰہ وردِ زباں — اپنے اندر جذب کر لے اک جہاں

فقر، جوع و رقص و عریانی نہیں
فقر، سلطانی ہے، رہبانی نہیں

۲۔ حکمت خیرِ کثیر ہے![126]

خیرِ وافر حق نے حکمت کو کہا — بہرہ ور حکمت سے ہو تو ہر جگہ

علم، حرف و صوت کا شہپر بنے — علم سے اک سنگ بھی گوہر بنے
علم کا افلاک پر بھی ہے گذر — چیر سکتا ہے یہ سورج کا جگر
علم کا مقصود ہے تفسیرِ کُل — علم کی تدبیر ہے تقدیرِ کُل
علم چاہے، دشت بن جائے حباب — علم چاہے، بحر بن جائے سراب
اس کی نظروں میں ہے حالِ کائنات — تاکہ دیکھے محکماتِ کائنات
دل میں گر حق ہو تو ہے پیغمبری — حق نہ دل میں ہو تو پھر ہے کافری
علم بے سوزِ دروں ہے شر تمام — اس سے ہیں تاریک بحر و بر تمام
اک جہاں اس کی ہلاکت کا شکار — اس سے باغِ زندگی ہے بے بہار
بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ — اس کے طیاروں کے بم سے داغ داغ
سینۂ افرنگ میں نار اس سے ہے — لذتِ شبخون و یلغار اس سے ہے
وہ پلٹ دے گردشِ ایام کو — لوٹ لے وہ دولتِ اقوام کو
اس کی قوت ہوتی ہے شیطاں کی یار — نور بھی ہو، نار کی صحبت سے نار
مارنا ابلیس کا مشکل ہے کام — دل کی گہرائی میں ہے اس کا مقام
اس کو بہتر ہے، مسلماں تم کرو؟[124] — کشتۂ شمشیرِ قرآں تم کرو!
ایک زحمت ہے، جلالِ بے جمال — اک مصیبت ہے فراقِ بے وصال
علم جو بے عشق ہے، طاغوت ہے — علم جو با عشق ہے، لاہوت ہے
بے محبت، علم ہے محرومِ نور — بے محبت عقل ہے منزل سے دور

کور کو تو صاحبِ دیدار کر
بولہب کو حیدرؓ کرّار کر[125]

—

زندہ رُود

آئنہ جس کا بنی اُم الکتاب — وہ جہاں ہے اب تلک زیرِ حجاب
کیوں نہیں ہوتا ہے وہ جلوہ نما — خلوتِ دل میں رہے گا کیا سدا؟
عالم اپنا، عالمِ فرسودہ ہے — ملّت اس کی خاک میں آسودہ ہے
مٹ گیا ہے سوزِ دل تاتار کا — مر گیا مسلم کہ قرآں مر گیا؟

سعید حلیم پاشا

کام ہے ملّا کا بس کافر گری — آبرو اسلام کی جاتی رہی
اپنی شبنم بحر ہے اپنے لیے — ہے ہمارا بحر بھی شبنم اسے
رکھے ایسے ڈھنگ یہ قرآں فروش — اس سے ہے جبریل بھی محوِ خروش
آخرت سے اس کا دل بیگانہ ہے — اس کو قرآنِ حکیم افسانہ ہے
وہ نہ سمجھا حکمتِ دینِ نبی — اس کی آنکھوں نے نہ پائی روشنی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — اس کی باتوں سے ہے ملّت فرد فرد
ملّا کیا سمجھے گا اسرارِ کتاب — اندھا کیا دیکھے گا نورِ آفتاب

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

مردِ حق خلوت گزیں سے جب ملے — میری جانب سے یہ کہنا تو اسے
فکر سے تیرے ہے مومن کی حیات — ہے نفس سے تیرے، ملّت کو ثبات
حرفِ حق کہنا ہی تیرا دین ہے — حفظِ قرآنِ عظیم، آئین ہے

تو ہے موسیٰ سرنگوں پھر کیوں ہوا — اٹھ! کراماتِ یدِ بیضا[127] دکھا!
سرگذشتِ ملتِ بیضا سنا — آہوؤں کو وسعتِ صحرا بتا!

رہنما تیرا ہے نورِ مصطفےٰؐ
ہے کہاں منزل ہماری، آ دکھا

مردِ حق دنیا سے کب لے رنگ و بو — مردِ حق لیتا ہے حق سے رنگ و بو
مردِ حق کی ہے نئی ہر آن شان[128] — جسم میں اس کے ہے ہر دم تازہ جان
مومنوں کو دے حقیقت کا پتا — شرحِ رمزِ "کلَّ یومٍ" پھر بتا
کارواں کی کعبہ ہی منزل بھی ہے — وقفِ حق ہی کارواں کا دل بھی ہے

میں نہیں کہتا، ہے اس کی اور راہ
کارواں بدلا ہے، بدلی ہے نگاہ

افغانی

ہے حدیثِ مصطفےٰؐ اسے خوش نصیب — دینِ اسلام اس جہاں میں ہے غریب[129]
کر حدیثِ مصطفےٰؐ پر غور و فکر — غربتِ دیں کب ہے فقرِ اہلِ ذکر
اس کو جو کرتا ہے حق کی راہ طے — غربتِ دیں، ندرتِ آیات ہے
ہے یہ غربت ہر زماں نوعِ دگر — پا یہ نکتہ، گر تو ہے اہلِ نظر
اپنا دل آیاتِ حق میں پھر لگا — تاکہ ہو محکوم، عصرِ نو ترا
کوئی بھی سمجھا نہ اسرارِ کتاب — کھا رہے ہیں اہلِ عالم پیچ و تاب
روس نے عالم کو نقشِ نو دیا — آب و ناں کو دین کے بدلے لیا

محوِ حق ہو، محو کر باطل نظام
روسیوں کو جا کے دے میرا پیام

پیغامِ افغانی ملّتِ رُوسیہ کے نام

منزل و مقصودِ قرآں اور ہے
رسم و آئینِ مسلماں اور ہے

آگ تو ہے دل میں، سوز زندہ نہیں
اس کے دل میں مصطفیٰؐ زندہ نہیں

حکمتِ قرآں سے وہ بے بہرہ ہے
اس کے ساغر میں نہ تلچھٹ ہے نہ مے

خود مٹایا قیصریّت کا رواج
خود ہی رکھا قیصری کا سر پہ تاج

جب نہالِ سلطنت پھیلا بڑھا
دین پر بھی نقشِ شاہی چھا گیا

جب ملوکیّت کا آ جاتا ہے دور
رسم و راہِ زیست ہو جاتے ہیں اور

اے کہ تو نے دھویا ہر نقشِ کہن
اک نئی تو نے سجائی انجمن

ہم مسلمانوں کی صورت تو نے بھی
قیصریّت اس جہاں سے ختم کی

تاکہ تیری شمعِ دل روشن رہے
درسِ عبرت لے ہمارے حال سے

پاؤں اپنے خوب میداں میں جما
پاس ان لات[۱۳۰] و ہبل کے پھر نہ جا

ایسی ملّت اس جہاں کو چاہیے
جو بشیر اور ہو نذیر اس کے لیے

لوٹ آ تو پھر سوئے اقوامِ شرق
تجھ سے ہی وابستہ ہیں ایامِ شرق

بھر دیا ہے تو نے جاں میں سوزِ نَو
تیرے دل میں روشنیِ روزِ نَو

غرب کا آئیں بھی، مذہب بھی کہن
تو پرستار ان کا پھر ہرگز نہ بن

ختم کر ڈالا خداؤں کو تمام
لا سے اِلّا کی طرف اب کر خرام[۱۳۱]

لا سے آگے بڑھ اگر جوینده ہے
جو کرے اثبات، بس وہ زندہ ہے

گر تو چاہے نظمِ عالم ہو بپا
اس کی بنیادوں کو بھی محکم بنا

داستانِ کہنہ دھوئی باب باب — حکمتِ قرآں سے جو اب فیضیاب
کس نے کالوں کو یدِ بیضا دیا؟ — مژدۂ لا قیصر و کسریٰ دیا؟ [131]
چھوڑ دے یہ جلوہ ہائے رنگ رنگ — پالے خود کو اور کر ترکِ فرنگ
مکرِ مغرب سے ہے گر تو باخبر — روبہی کو چھوڑ، شیری پیشہ کر
روبہی کیا ہے، تلاشِ ساز و برگ — شیرِ حق جویائے آزادی و مرگ [132]
شیری، بے قرآں کے ہے روبہی — فقر قرآں سے ہے بنیادِ شہی
فقرِ قرآں ہے ربطِ ذکر و فکر [133] — فکر کو کامل نہ دیتا ہے ذکر
ذکر، شوقِ دل کو سکھلانا ادب — کارِ جاں ہے یہ نہ کارِ کام و لب
اس سے اٹھیں شعلہ ہائے سینہ سوز — تیرا دل اس سے نہیں واقف ہنوز

اے شہیدِ شاہدِ رعنائے فکر
دیکھ لفظوں میں تجلّی ہائے فکر

کیا ہے قرآں، خواجہ کو پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
خیر مت ڈھونڈ اک حریصِ زر سے تُو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا [134]
ہے جہاں میں سود صد وجہِ فتن — لذتِ جاں، لذتِ قرضِ حسن
سود سے جاں تیرہ، دل ہے مثلِ سنگ — آدمی درندہ بے دندان و چنگ
رزق کا لینا زمیں سے ہے روا — یہ ہے مالِ بندہ اور ملکِ خدا
حق ہے مالک اور مومن ہے امیں — غیرِ حق ہر شے ہے ہالک بالیقیں [135]
رایتِ حق بادشاہوں سے نگوں — شہر ان کے دخل سے خوار و زبوں [136]

ہے ہمارے رزق کا اک مائدہ
نسلِ آدم ہے "کنفسٍ واحدہ"[137]

جب جہاں میں نقشِ حق قائم ہوا — نقشِ[138] شاہ و کاہن و پاپا مٹا
رازِ دل کہتا ہوں تجھ سے بے حجاب — ہے یہ قرآں اور شے کب ہے کتاب
جان میں جا کر بدل دیتا ہے جاں — جان جب بدلے، بدلتا ہے جہاں
مثلِ حق پنہاں بھی ہے پیدا بھی ہے — زندہ بھی پائندہ بھی گویا بھی ہے
اس میں ہیں تقدیر ہائے غرب و شرق[139] — سرعتِ اندیشہ بخشے مثلِ برق
سربکف رہ، یہ مسلماں سے کہا — بخش دے جو کچھ ہو، حاجت کے سوا[140]
اپنا جو آئیں بنایا تو نے اور — نورِ قرآں سے ذرا کر اس میں غور

جان لے گا تو بم و زیرِ حیات
تو سمجھ جائے گا تقدیرِ حیات

اپنی[141] محفل میں نہ ساقی ہے نہ مے — سازِ قرآں کی نوا البتہ ہے
زخمہ اپنا گر نہیں رکھتا اثر — آسماں رکھے ہزاروں زخمہ ور
ذکرِ حق ہے ہر جہاں سے بے نیاز — ہے زماں سے اور مکاں سے بے نیاز
ذکرِ ذاکر سے ہے ذکرِ حق جدا — وہ کہاں محتاج روم و شام کا
ہم سے یہ نعمت اگر حق چھین لے — دوسری اقوام کو وہ بخش دے
ہے مسلماں بستۂ تقلید و ظن — دیکھ کر یہ کانپتا ہے میرا تن
چھن نہ جائے اس سے یہ دولت کہیں — بن نہ جائیں دوسرے اس کے امیں

مرشد رومی، زندہ رود کو شعر کی فرمائش کرتے ہیں

مرشدِ رومی، امامِ اولیا — ہو گیا محزوں جب اس نے یہ سنا

اس کے دل سے نکلی آہِ جانگزا — غیرتِ خونِ شہیدِ اشک اس کا تھا
قلبِ مرداں صید اس کے تیر کا — سوئے افغانی نگہ کی اور کہا
"دل کو غرقِ خوں کریں مثلِ شفق — اور خود ہوں بستۂ فتراکِ حق"[۱۴۲]
جان ہے امید سے جوئے رواں — اور نومیدی ہے مرگِ جاوداں
اس نے دیکھا میری جانب اور کہا — آگ دل میں اپنے شعروں سے لگا
ناقہ اپنا خستہ اور محمل گراں — چاہیے تلخ اب نوائے ساربانؔ[۱۴۳]
مرد کی ہے آزمائش ابتلا — تشنگاں کو تشنہ تر کرنا روا
مثلِ موسیٰ پار کر دریائے نیل — کود جا تو آگ میں مثلِ خلیل

وہ نوائے دل، ہو جس میں بوئے دوست
قوم کو ہے رہنمائے کوئے دوست

غزلِ زندہ رود

تری نظر میں گل و لالہ گو مقیم ہیں سب
سفر میں یہ صفتِ موجۂ نسیم ہیں سب
تلاشِ معنیٔ تازہ ہے پر کہاں پائیں
کہ مکتب و حرم و میکدہ عقیم[۱۴۴] ہیں سب
نوائے دل کو سمجھ، اپنے دل کی آگ میں جل
کہ طور و صومعہ اس بار بے کلیم ہیں سب
صفائے قلب کہاں اور کہاں یہ تکیہ نشیں!
یہ پھول لاکھ شگفتہ ہیں بے شمیم ہیں سب

بنا لیے ہیں حرم ہی میں اہلِ حق نے حرم
زباں سے ایک ہیں دل سے مگر دو نیم ہیں سب
نہیں یہ بات کہ ہے بزم شور سے خالی
ہے بس یہ بات کہ بے بادہ و ندیم ہیں سب

فلکِ زہرہ[۱۴۵]

درمیانِ ارض و نورِ آفتاب — سینکڑوں حائل فضاؤں کے حجاب
سینکڑوں پردے نظر کے سامنے — چھن رہے ہیں جن سے جلوے نور کے
تاکہ کم سوزی سے ہو دل سوز تر — پار ہے ہیں زیست اس سے برگ و بر
سوز سے اس کے رگِ لالہ میں خوں — رقص سے اس کے ندی، سیماب گوں
خاک سے انگڑائی لیتی ہے حیات — اور رواں ہوتی ہے سوتے بے جہات
اس کی رہ میں مرگ و حشر و حشر و مرگ — صرف تاب و تب ہیں اس کو ساز و برگ
آسمانوں میں سما جاتی ہے وہ — ان میں گم ہو کر نکل آتی ہے وہ
خود ہی کعبہ، خود ہی ابراہیم بھی — خود انا بھی، خود سرِ تسلیم بھی
ہیں یہ نو[۹] افلاک تو خیبر اسے — حق نے بخشی ضربتِ حیدر اسے
یہ مسلسل جنگ، پاک اسکو کرے — محکم و سیّار و دانا وہ بنے
کرتی ہے پرواز وہ گردوں سے پار — جبرئیل و حور ہیں اس کے شکار

نورِ "ما زاغ البصر"[۱۴۶] اس کو ملے
عبدہٗ کا مرتبہ حاصل کرے

گو نہیں میں جانتا اپنا مقام — ساتھیوں سے ہے جدا میرا مقام

میرے دل میں جنگ بے خیل و سپاہ — اس کو وہ دیکھے جو رکھتا ہو نگاہ
ہوں سرِ میدانِ رزمِ کفر و دیں — اور تنہا مثلِ زین العابدینؓ
ہے کوئی رہبر نہ منزل کا پتا — ہے چراغِ راہ بس میری نوا
غرقِ دریا سب ہوئے برنا و پیر — پہنچا ساحل پہ بس اک مردِ فقیر
ڈھا رہا ہے شوقِ بے پروا ستم — وصل کا ہے خوف، فرقت کا ہے غم
وصل ہے پایانِ شوق اے دل اگر — ہجر تو بہتر ہے فغانِ بے اثر
جستجوئے راہ کیوں رہرو کرے — گر فراغت سازگار آئے اسے
جذبۂ ذوقِ نظر ہر دم مرا — چاہتا ہے سیر کو عالم نیا
رومی بولا جو تھا مجھ سے باخبر — سامنے دیکھو اپنے اک عالم دگر
عشق شاطر ہے، ہم اس کا مہرہ ہیں — واردِ دشتِ سوادِ زہرہ ہیں
آب و گل ہیں اس جہاں کے نقش باف — اس پہ ہے مثلِ حرم کالا غلاف
تجھکو حاصل ہے نگاہ پردہ در — زہرہ کی کالی گھٹاؤں سے گذر ۔
اس میں رہتے ہیں خدایانِ کہن — میں انہیں پہچانتا ہوں تن بہ تن
بعل و حبر دوخ و یعوق و نسر و فسر — رم خن و لات و منات و عسر و غنر

دیتے ہیں اپنی بقا کی یہ دلیل
آج کا ہے دور، دورِ بے خلیل

مجلسِ خدایانِ اقوامِ قدیم

وہ ہوائے تند وہ ابرِ سیاہ — برق بھولے جس کی تاریکی میں راہ
اک سمندر تھا ہوا کے دوش پر — جس کی موجوں کا تھا دامن بے گہر

بے کراں قلزم تھا موجیں گرم خیز
جو ہواؤں سے نہ تھیں گرمِ ستیز

وہ سمندر، میں، وہ مردِ باکمال
جس طرح دل کے شبستاں میں خیال

وہ سفر سے باخبر، میں نو سفر
آنکھوں میں بے صبر تھی میری نظر

کہہ رہا تھا اس سے میں یہ ہر زماں
وہ نیا عالم نجانے ہے کہاں؟

کوہسار آخر نظر آئے مجھے
مرغزار و آبجو تھے سامنے

اس کے صحرا صد بہار اندر کنار
مشکبار اس کی نسیمِ کوہسار

نغمہ ہائے طائرانِ ہم نفس
چشمہ زار و سبزہ ہائے نیم رس

تن ہوا کے فیض سے پایندہ تر
جان اس سے جسم میں بینندہ تر

کوہ سے میں نے جو ڈالی اک نظر
خرّم و شاداب پائے دشت و در

ساری وادی کی فضا تھی پُر بہار
آبِ حیواں جس کی مٹی پہ نثار

تھے وہاں پر سب خدایانِ کہن
وہ خدائے مصر، یہ ربِّ یمن!

وہ عرب کا رب ہے، یہ ربِّ عراق [۱۴۸]
یہ خدائے وصل، وہ ربِّ فراق

ابن مہر ہے، ماہ کا شوہر کوئی
کوئی ہے شیدائے زوجِ مشتری

ہاتھ میں اس کے ہے اک تیغِ دودم
کھائے سانپ اس کے گلے میں پیچ و خم

سب کے دل میں دہشتِ ذکرِ جمیل
سب کے دل آزردۂ ضربِ خلیل

بولا مردوخ، "آدمی بے دیں ہوا
چھوڑا کعبے کو کلیسا سے گیا

تاکہ ہو ادراک اس کا تیز تر
عہدِ رفتہ پر وہ رکھتا ہے نظر

لطف بخش اس کو ہیں آثارِ کہن
محفلوں میں ہم ہیں موضوعِ سخن

لی زمانے نے ہے اک کروٹ نئی
اب فضا اپنے موافق پھر ہوئی

نغمہ پیرا بعل خوش ہو کر ہُوا
یوں ہمارے راز کو افشا کیا

نغمۂ بعل

چھان ماری آدمی نے یہ فضا — پر نہ گردوں سے پرے دیکھا خدا
قلزمِ افکار ہے انساں کا دل — جس میں ہر دم اک نیا طوفاں اٹھا
اس کی جاں طالب ہے محسوسات کی — شاید آئے دور پھر گذرا ہوا
اہلِ مغرب نے کیا ہم پر کرم — قبر سے کھودا ہمیں زندہ کیا

اے خدایانِ کہن، ہے وقت ابھی!

لشکرِ اسلام نے کھائی شکست — اہلِ وحدت میں نہیں ذوقِ الست[۱۴۹]
بزمِ برہم جام اس کا پاش پاش — جو مئے جبریل سے ہوتا تھا مست
آب و گل کی قید میں ہے مردِ حُر — ہے پرستارِ وطن یزداں پرست[۱۵۰]
رونقِ بت خانہ میں وہ کھو گیا — ہے صنم در دل کہ تھا قرآں بدست

اے خدایانِ کہن، ہے وقت ابھی!

لوٹ آئے پھر وہ ایامِ طرب — غالب آئے دیں پہ ملک و نسب
اب چراغِ مصطفیٰؐ سے کیا خطر — ہیں اسے گل کرنے کو سو بولہب
لاکھ ہے لب پر صدائے لا الٰہ — یہ صدائے لب، صدائے دل ہے کب؟
زندہ مغرب نے کیا شیطان کو — روزِ یزداں کو ہے لاحق خوفِ شب

اے خدایانِ کہن، ہے وقت ابھی!

بندِ دیں، گردن سے اس کی کھولیے — تاکہ پھر انساں کو آزادی ملے
ہے نماز اس کے لیے بارِ گراں — رکعتِ بے سجدہ ہم کو چاہیے
ہوتے ہیں نغمات سے جذبے بلند — لطف کیا طاعت میں بے نغمہ ملے
دیو بہتر ہے جو آتا ہے نظر — اس خدا سے جو سدا مخفی رہے

اے خدایانِ کہن ہے وقت الحی!

قلزمِ زہرہ کی تہ میں جانا

اور

فرعون و کچنر کی ارواح سے ملنا

پیرِ رومی صاحبِ ذکرِ جمیل ضرب اس کی سطوتِ ضربِ خلیل
یوں ہوا مستی میں وہ نغمہ سرا ہر خدائے کہنہ سجدے میں گرا

غزل

آئندہ و رفتہ پہ نظر چاہیے کرنا
اٹھ فکر تجھے بارِ دگر چاہیے کرنا
عاشق ہے تو رکھ زیرِ قدم ناقۂ ایام
گردوں سے پرے تجھ کو سفر چاہیے کرنا
دنیا تو نہیں دوستو اک رنگ پہ قائم
دنیا سے ہمیں قطعِ نظر چاہیے کرنا
تو چھوڑ کے دنیا کو رہا عاشقِ دنیا
خود کو ہی تجھے صرفِ نظر چاہیے کرنا
میں نے کہا "دل میرا صنم خانہ بنا ہے"
اس نے کہا "یہ زیر و زبر چاہیے کرنا"

مرشدِ رومی نے پھر مجھ سے کہا "ساتھ میرے تو قدم آگے بڑھا"
وہ کہستاں وہ جبالِ بے کلیم برف سے لگتے ہیں جو انبارِ سیم
اس کے پیچھے قلزمِ شفاف تھا جس کا پانی صاف جیسے آئنہ
موج کا، اس میں نہ طوفاں کا مقام طاری رہتا ہے سکوں اس پر مدام
اس جگہ ہیں سرکشانِ زور مست منکرانِ غائب و حاضر پرست
اِس کا مسکن شرق تھا اُس کا تھا غرب دونوں اہلِ حق سے تھے سرگرمِ حرب
اس کی گردن پر ہے گرچہ چوبِ کلیم[۱۵۲] تیغ سے درویش کی وہ ہے دو نیم
دونوں فرعون اک صغیر اک ہے کبیر دونوں ہی دریا کے اندر تشنہ میر[۱۵۳]
موت سے ہے گرچہ ہر شخص آشنا جابروں کی موت، آیاتِ خدا
رکھ قدم آگے بلا خوف و خطر ساتھ تو چل ہاتھ میرا تھام کر

شق میں کر ڈالوں گا سینہ بحر کا
قلب میں اس کے تجھے لے جاؤں گا

سینۂ دریا اچانک شق ہوا یا وہ پانی ہی نہ تھا وہ تھی ہوا
اس کی تہ میں وادیِ بے رنگ و بو جس میں تاریکی تھی چھائی چار سُو
سورۂ طٰہٰ[۱۵۴] جو رومی نے پڑھی ہر طرف دریا میں پھیلی چاندنی
کوہ اس کے شستہ و عریاں و سرد ان میں تھے سرگشتہ و حیراں دو مرد
ڈالی رومی پر انہوں نے اک نظر وہ ہوئے حیران ہم کو دیکھ کر
بولا یہ فرعون "کیسا ہے یہ نور؟ جو مثالِ صبح پھیلا نزد و دور"

رومی

ہر نہاں ہے آشکار اس نور سے نور ہے یہ شعلہ ہائے طور سے

فرعون

اف گنوایا میں نے نقدِ عقل و دیں
دیکھا یہ نور اور پہچانا نہیں

اے جہاں دارو مجھے دیکھو ذرا!
اے زیاں کارو مجھے دیکھو ذرا!

ہائے وہ ملّت جو دولت کیلیے
لاشیں مُردوں کی نکالے قبر سے

لاش جو زیبِ عجائب گھر بنے
اپنے چپ ہونٹوں سے افسانہ کہے

وہ شہنشاہی کی دیتی ہے خبر
اور عطا کرتی ہے اندھوں کو نظر[155]

مقصدِ کارِ سلاطیں ہے شقاق
خود کا استحکام، اوروں کا نفاق

مکر سے ان کے زبوں تقدیرِ ملک
باطل و آشفتہ ہے تدبیرِ ملک

پھر اگر دیکھوں کلیم اللہ کو
ان سے مانگوں اک دلِ آگاہ کو

رومی

نورِ جاں جب تک نہ ہو شاہی ہے خام
بادشاہی بے یدِ بیضا حرام

ضعفِ محکوماں سے ہے اس کو دوام
دولتِ سلطاں ہے حرمانِ عوام!

تاجِ شاہی کو جو دیتا ہے خراج
سنگ بھی وہ ہو تو سمجھو ہے زجاج[156]

فوج و زنداں ایک طورِ رہزنی
ہے وہی حاکم جو ہو، ان سے غنی

ذوالخرطوم[157]

صیدِ حرص و آز افرنگی نہیں
قبر اس نے بہرِ زر کھودی نہیں

سرگذشتِ مصر و فرعون و کلیم[158]
ہم سے کہتے ہیں یہ آثارِ قدیم

علم و حکمت کا شفِ اسرار ہیں
ہوں اگر بے جستجو، بے کار ہیں

فرعون

قبر میری بہرِ حکمت چاک کی
تربتِ مہدی میں کیا شے تھی چھپی؟

درویش سوڈانی[۱۵۸] کی روح کا نمودار ہونا

برق بے تابانہ چمکی زیرِ آب — لہر اک طوفاں کی اٹھی زیرِ آب
گلشنِ جنت سے بادِ خوش چلی — روح آئی مصر کے درویش کی
اس کے سوزِ دل سے گوہر گھل گیا — سینۂ کشنز میں پتھر گھل گیا
بولا "اے کشنز! ہے عبرت کا مقام — تجھ سے یوں لے خاکِ درویش انتقام
خاکِ تربت بھی نہ تجھ کو مل سکی — لاش تیری دفن دریا میں ہوئی"
غم سے آواز اس کی پھر بھرا گئی — آہِ پر سوز اس کے سینے سے اٹھی
بولا "اے روحِ عرب بیدار ہو — مثلِ آبا خالقِ اعصار ہو
اے فؤاد[۱۶۰]، اے فیصل[۱۶۱]، اے ابنِ سعود[۱۶۲] — باہم آویزش یہ کب تک مثلِ دود
دل میں پیدا سوزِ رفتہ کو کرو — زندہ پھر عہدِ گذشتہ کو کرو
خاکِ بطحا دے ہمیں خالدؓ[۱۶۳] نیا! — نغمۂ توحید پھر ہم کو سنا!
خاک سے کیا تیری اے ارضِ عرب! — اٹھ نہیں سکتا کوئی فاروقؓ اب؟[۱۶۴]
اے جہانِ مومنانِ مشکِ فام![۱۶۵] — تجھ سے آتی ہے مجھے بوئے دوام
زندگانی کب تلک بے ذوقِ سیر — کیوں تری تقدیر کے مالک ہوں غیر

کیوں نہیں پاتا ہے تو اپنا مقام　　مجھکو تڑپاتا ہے جوشِ انتقام
خوف مت کھا سُن حدیثِ مصطفیٰؐ
"مرد کو روزِ بلا، روزِ صفا"

دوست یثرب میں ہیں اور ہم نجد میں[۱۶۶]　　ساربان ناقے کو لے آ وجد میں[۱۶۷]
ابر برسا خاک پر سبزہ اگا　　مست شاید اس لیے ناقہ ہوا
دردِ فرقت سے نہیں دل کو قرار　　جو ہو بے صبر، وہ رہ کر اختیار
ناقہ مستِ سبزہ، میں ہوں مست دوست　　تو ہے مختار اس کا، میرا دستِ دوست
دشت میں ہے چشمۂ آبِ رواں　　تازہ پھولوں سے بھری ہیں وادیاں
وہ پہاڑی پر سے اترے دو ہرن　　پیچھے ہیں اک دوسرے کے گامزن
چشمۂ صحرا سے کچھ پانی پیا　　راہ پیما کی طرف پھر رخ کیا
تم سے ریگِ دشت، مثلِ پرنیاں　　راہ ناقے پر نہیں اب کچھ گراں
کالے بادل، دل کے دل چھائے ہوئے　　دور گھر ہے خطرہ بارش کا لگے

دوست یثرب میں ہیں اور ہم نجد میں
ساربان ناقے کو لے آ وجد میں!

فلکِ مریخ[۱۶۸]

بند کیں جب زیرِ آب آنکھیں ذرا　　یوں لگا گویا کہ میں بے خود ہوا
اک نیا عالم تھا میرے سامنے　　جس جگہ وقت و مکاں کچھ اور تھے
آفتاب اس کے افق پر جلوہ گر　　تھے مگر کچھ اور ہی شام و سحر
رسم و راہِ جاں سے تن بیگانہ تھا　　وقت میں تھا، وقت سے نا آشنا

جان کو ہر سوزِ دل ہے سازگار — وقت ہے ہر روز اس کا پُر بہار
اس کو کب کہنہ کرے پروازِ روز — دن ہیں اس کے نور سے عالم فروز

گردشِ دوراں کا ہے اس سے وجود
ہے اسی سے ہر جہانِ ہست و بود

ایک جنگل میں رصد گاہِ بلند — دُوربیں جس کی ثریا در کمند
یہ کوئی خلوت گہِ افلاک ہے — یا وہی دنیائے آب و خاک ہے
اس کی حد کو ڈھونڈتا تھا میں کبھی — اور کبھی گردوں پہ تھیں نظریں مری
مرشدِ رومی نے یہ مجھ سے کہا — دیکھ تو یہ ہے جہاں مریخ کا
یہ جہاں بھی ہے جہانِ رنگ و بو — ہیں یہاں بھی دشت و شہر و کاخ و کو
اس کے ساکن مردمانِ علم و فن — ہم سے بڑھ کر ان کا علم جان و تن
ہیں زماں پہ اور مکاں پہ حکمراں — وہ فضائے آسماں کے رازداں
گردشِ افلاک پہ ان کی نظر — ہر خم و پیچِ فضا سے باخبر
خاکیوں کے دل میں فکرِ آب و گل — اس جہاں میں ہے بدن کو فکرِ دل
دل جب آب و خاک میں منزل کرے — حکم اس کا آب و گِل پر تب چلے
حکمِ جاں سے مستی و ذوق و سرور — حکمِ جاں سے تن کو ہے غیب و حضور
اس جہاں میں ہیں ہمارے دو وجود — جسم و جاں، اک بے نمود اک بانمود
خاکیوں کو جان و تن مرغ و قفس — فکرِ مریخی ہے یک اندیشہ، بس
جب کسی کا آتا ہے روزِ فراق — چست اسے کر دیتا ہے سوزِ فراق
موت کے آنے سے کچھ دن پیشتر — موت کے آنے کی دیتا ہے خبر
جان ان کی، تن کی پروردہ نہیں — اس لیے وہ تن کی خوکردہ نہیں
جسم کو خود میں سمونا موت ہے — ذات میں اپنی ہی کھونا موت ہے

فکر سے تیرے ہے برتر، یہ سخن چونکہ تیری جاں ہے محکومِ بدن
دو گھڑی کے واسطے ٹھیر اس جگہ!
ایسا موقع کس کو دیتا ہے خدا!

مریخ کے ستارہ شناس کا رصد گاہ سے باہر آنا

ایک بوڑھا جس کی ڈاڑھی مثلِ برف کی حصولِ فن میں جس نے عمر صرف
تیز بیں تھا مثلِ دانایانِ غرب وضع میں تھا مثلِ ترسایانِ غرب
قامت اس کا قامتِ بالائے سرو صورت اس کی صورتِ ترکانِ مرو[۱۷۹]
آشنائے رسم و راہِ ہر طریق اس کی آنکھوں سے عیاں فکرِ عمیق
دیکھ کر انسان کو وہ خوش ہوا اور زبانِ فارسی میں یہ کہا
"پیکرِ گِل! اے اسیرِ رنگ و بو پست و بالا سے ہوا آزاد تو
خاک کو پروازِ بے طیارہ دی ثانیوں کو فطرتِ سیارہ دی"
نطق و ادراک اس کے مثلِ آبجو حیرت انگیز اس کا طرزِ گفتگو
ہے کوئی یہ خواب یا افسوں گری لب پہ مریخی کے یہ حرفِ دری
"مصطفےٰ[۳] کے عہد میں"، اس نے کہا 'ایک مریخی تھا مردِ باصفا
اس کے دل میں ایک دن پیدا ہوئی خواہشِ سیرِ جہانِ آدمی
اس نے کی پرواز پھر روئے زمیں اور عرب کے دشت میں اترا کہیں
مشرق و مغرب کا حال اس نے لکھا اس کا اندازِ بیاں رنگین تھا
میں نے بھی دیکھے ہیں ایران و فرنگ اور دیکھے ملکِ نیل و رودِ گنگ
میں گیا امریکہ و جاپان و چیں بہرِ تحقیقِ فلزاتِ زمیں

ہوں شب و روزِ زمیں سے باخبر　　میں نے دیکھے ہیں زمیں کے خشک و تر
جانتے ہیں ہم جہانِ آدمی
گرچہ ہم اس کے لیے ہیں اجنبی

رومی

میں ہوں نوری اور خاکی ہم سفر　　پی نہیں مے اس نے، بیخود ہے مگر
ہے قلندر نام اس کا زندہ رود　　کام اس کا ہے تماشائے وجود
آپ کے اس شہر میں آئے ہیں ہم　　فکرِ دوراں ہے نہ ہے دنیا کا غم
جلوہ ہائے نو بہ نو کی ہے طلب　　رہنمائی سوئے منزل کیجیے اب

حکیم مریخی

یہ جگہ ہے مرغدین[۱۷۰] برخیا[۱۷۱]　　برخیا دادا کا میرے نام تھا
فرز مرز[۱۷۲] اک آمرِ بد ذات تھا　　برخیا سے اس نے جنت میں کہا[۱۷۳]
تو یہاں ہے اور شاداں، ہے عجب　　تو رہے محکومِ یزداں، ہے عجب
اک جہاں بہتر ہے تیرے ملک سے　　ہیچ ہے جنت بھی جس کے سامنے
وہ جہاں ہے ہر جہاں سے بھی بلند　　وہ جہاں ہے لامکاں سے بھی بلند
اس جہاں سے ہے خدا بھی بے خبر　　ہر جہاں سے وہ جہاں آزاد تر
نظم میں اس کے نہیں یزداں دخیل　　ہے رسول اس میں، نہ کوئی جبرئیل
ہے طواف اس میں نہ تکلیفِ سجود　　ہے دعا اس میں نہ تسبیح و درود
برخیا بولا کہ "اے مکّارِ جا!　　تو ہی اس عالم پہ نقش اپنا جما"
اس کے دھوکے میں نہ آئے برخیا　　حق نے ہمکو اک نیا عالم دیا

آ ہمارے ملک کی تو سیر کر!
دیکھ اس کے رسم و آئین و ہنر!

شہرِ مرغدیں کی سیر

مرغدیں کی وہ عمارات بلند — کیا حسیں تھا وہ مقامِ ارجمند
لوگ تھے شیریں، سخن میں شکلِ نوش — خوب صورت خوب سیرت سادہ پوش
علم حاصل ان کو بے درس و کتاب — جانتے تھے کیمیائے آفتاب
سیم و زر کرتے تھے حاصل نور سے — ہم نمک لیں جیسے آبِ شور سے
خدمت ان کا مقصدِ علم و ہنر — کام کرتے تھے نہ بہرِ مال و زر
کچھ نہ تھی واں قدرِ دینار و درم — اِن بتوں سے خالی تھے ان کے حرم
ذہن پہ حاکم نہیں دیوِ مشیں — دود سے اس کی فضا تیرہ نہیں
اس کے دہقانوں کا روشن ہے چراغ — وہ خدا کے خوف سے فارغ دماغ
پانی کی تقسیم کے جھگڑے نہیں — ہے وہ مالک جوتتا ہے جو زمیں
فوج اس میں تھی نہ رسمِ کارزار — کشت و خوں پہ تھا نہ روزی کا مدار
جھوٹ سے اُسجا نہیں فن کو فروغ — اور نہ تحریروں سے تشہیرِ دروغ

کوئی بیکار اس ولایت میں نہیں
سائلوں سے خالی تھی یہ سرزمیں

حکیمِ مرّیخی

کوئی سائل ہے نہ یاں محروم ہے
کوئی حاکم ہے نہ یاں محکوم ہے

زندہ رود

سائل و محروم بھی، تقدیرِ حق — حاکم و محکوم بھی، تقدیرِ حق[۱۷۴]
خالقِ تقدیر ہے ذاتِ خدا — چارۂ تقدیر ہو سکتا ہے کیا؟

حکیمِ مرحوم

گر ہو اک تقدیر سے زحمت تجھے — دوسری تقدیرِ حق سے مانگ لے
آرزو تقدیرِ نو کی ہے روا — حق کی تقدیرات ہیں لاانتہا
جو ہیں محرومِ خودی اہلِ زمیں — راز وہ تقدیر کا سمجھے نہیں
غور کر تو بات ہے یہ اتنی سی — تو جو بدلے، بدلے قسمت بھی تری
خاک بن! نذرِ ہوا تجھکو کرے — سنگ بن! تیشے پہ دے مارے تجھے
تو ہے اوس! افتندگی تقدیر ہے — بحر ہے! پایندگی تقدیر ہے
تو بناتا ہے سدا لات و منات — ان سے تو رکھتا ہے امیدِ نجات
خود کو پانا گر نہیں ایماں ترا — فکر کا عالم ترا، زنداں ترا
رنج و زحمت ہیں، تو ہیں تقدیر سے[۱۷۵] — گنج و دولت ہیں، تو ہیں تقدیر سے
ہے یہی گر اصلِ دیں اے بے خبر — کیوں نہ ہو محتاج پھر محتاج تر؟
آہ وہ دیں، خوابِ جو طاری کرے — خوابِ غفلت میں سدا تجھ کو رکھے

کہیے اس کو سحر و افسوں یا کہ دیں؟
کہیے اس کو حبِّ افیوں یا کہ دیں؟

کیسے پایا طبع نے تیرے شعور؟ — کیسے آئی محملِ خاکی میں حور؟
ہے کہاں سے قوتِ فکرِ حکیم؟ — ہے کہاں سے طاقتِ ذکرِ کلیمؑ؟

ہے عطا کس کی، یہ دل، یہ واردات؟ فیض کس کا، یہ فنون و معجزات؟
خوبیِ گفتار تجھکو کس نے دی؟ گرمیِ کردار تجھکو کس نے دی؟
ہے یہ سارا فیض، فطرت کی عطا اور خود فطرت کا خالق ہے خدا
ہے یہ تیری زندگی کانِ گہر تو امیں ہے، حق ہی مالک ہے مگر
طبعِ روشن، مردِ حق کی آبرو خدمتِ مخلوق اس کی آرزو

خدمتِ مخلوق ہے پیغمبری
مُزدِ خدمت مانگنا سوداگری

اور یہ آب و باد و خاک و ابر و کشت باغ و راغ و کاخ و کوی سنگ و خشت
تو نے جانا ان کا مالک تو بنا مردِ ناداں ان کا مالک ہے خدا
خود کو مالک ارض کا سمجھا ہے تو کیا ہے بتلا معنیِ "لَا تُفْسِدُوْا"
آدمی نے شیطنت کی اختیار شیطنت تو ہے سراپا اعتشار
آدمی کو کب خیانت ہے روا تو خدا کو سونپ دے مالِ خدا
تو نے لی وہ چیز جو تیری نہیں یہ امانت دار کی خوبی نہیں
صرف اپنی چیز پر حق ہے ترا دوسروں کی شے پہ تیرا حق ہے کیا؟
اس جہاں کو تو خدا کو سونپ دے تاکہ تیرا کام آساں ہو سکے
فقر و غربت ہے جہاں میں اسلیے مالِ حق ہے، اپنا تو سمجھا جسے
جو نہ نکلا قیدِ آب و رنگ سے اس نے توڑا اپنا شیشہ سنگ سے
اے کہ منزل کی نہیں تجھ کو خبر! قیمتِ ہر شے ہے اندازِ نظر!
مال تیرا ہے تو گوہر ہے گہر ورنہ کوڑی کا نہیں وہ مال و زر

بدلے گر تیری نظر، بدلے جہاں
اور بدل جائیں زمین و آسماں

مرّیخ کی دوشیزہ کا حال
جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا

شہر کے دیکھے ہزاروں کوی و کاخ
پہنچے پھر ہم نزدِ میدانِ فراخ

تھا وہاں پر اک ہجومِ مرد و زن
جس میں اک عورت تھی رشکِ نارون

چہرہ روشن تھا مگر بے نورِ جاں
معنی سے محروم تھا اس کا بیاں

آنکھ بے نم، سوز سے خالی سخن
آرزو دل میں، نہ جینے کی لگن

اس کا دل جوشِ جوانی سے تہی
اس کی شکل آئینے کے قابل نہ تھی

اس کا دل ناواقفِ آئینِ عشق
"صعوۂ رد کردۂ شاہینِ عشق"[۱۷۷]

ہم سے یوں بولا وہ مردِ آگہی
یہ جواں عورت نہیں مرّیخ کی!

سادہ دل ہے پاک ریو و رنگ سے[۱۷۸] [۱۷۹]
اس کو لایا فرزمرز افرنگ سے

پختہ کار اس کو نبوت میں کیا
اس جہاں میں پھر اسے لاکر رکھا

کہتی ہے، تھا میرا مسکن آسماں
میری دعوت، دعوتِ آخر زماں

وہ بتاتی ہے مقامِ مرد و زن
صاف بتلاتی ہے اسرارِ بدن

زندگانی اس کی نظروں میں ہے کیا؟
یہ حقیقت تم کو دیتا ہوں بتا!

نبیّۂ مرّیخ کی تقریر

اے زناں! اے مادراں! اے خواہراں
کب تلک جینا مثالِ دلبراں؟

ہے یہ مظلومی، نہیں ہے دلبری
ہے یہ محکومی، نہیں ہے دلبری

ہم بنا کر اپنے گیسوئے تابدار — مرد کو اپنا سمجھتے ہیں شکار
مرد بنتا ہے شکاری، بن کے صید — تجھ پہ منڈلا کر تجھے کرتا ہے قید
اس کے نالے اس کی آہیں سب فریب — اس کی درد و غم کی باتیں سب فریب
گرچہ وہ تجھکو بتاتا ہے حرم — کرتا ہے وہ مبتلائے درد و غم
اس کا ساتھی بننا آزارِ حیات — زہر وصل اس کا، فراق اس کا نبات
سانپ ہے وہ اس سے تو خود کو بچا — زہر اس کا اپنے خوں میں مت ملا

زرد رو عورت ہوئی، جب ماں بنی
ہے کنوارے پن کی آزادی بھلی

آرہی ہے پے بہ پے وحیِ خدا — بڑھ رہا ہے دم بدم ایماں مرا
ایسی ایجادیں جہاں میں ہو گئیں — ہم بدن میں دیکھ سکتے ہیں جنیں
کشتِ جاں میں پھول جو چاہو کھلے — بیٹیاں، بیٹے، جو تم چاہو ملے
گر نہ مرضی کے مطابق ہو جنیں — اس کو کر دینا ہے ضائع، عینِ دیں
دہر میں آئیں گے اور اعصار بھی — آشکارا ہوں گے اور اسرار بھی
پا لیے جائیں گے جنیں اس طور پر — بے شبِ ارحام دیکھیں گے سحر
تاکہ ہو جائے فنا یہ اھرمن — مثلِ حیوانات ایامِ کہن
لالۂ بے داغ و با دامانِ پاک — بے نمِ شبنم اگائے گی یہ خاک
خود بخود کھل جائیں گے اسرارِ زیست — نغمۂ بے مضراب دے گا تارِ زیست
دیکھ مت تو ابرِ نیساں کی طرف — زیرِ دریا تشنہ مر جائے صدف!

اٹھ تو فطرت سے ہو پیکار آزما
تاکہ عورت ہو غلامی سے رہا

رومی

دینِ عصرِ نو کا آئیں یہ ہے دیکھ — حاصلِ تہذیبِ لادیں یہ ہے دیکھ
زندگی کا مذہب و آئیں ہے عشق! — حاصلِ تہذیب ہے دیں، دیں ہے عشق
اس کا ظاہر سوزناک و آتشیں — اس کا باطن نورِ ربّ العالمیں
عشق کے سوزِ دروں سے علم و فن — عشق کے ذوقِ جنوں سے علم و فن

دین کب پختہ ہو بے آدابِ عشق
حاصلِ دیں ہیں فقط اربابِ عشق

فلکِ مشتری [۱۸۳]

حلاج و غالب اور قرۃ العینِ طاہرہ کی ارواحِ جلیلہ جنھوں نے بہشتی نشیمن پسند نہ کیا اور گردشِ جاوداں اختیار کیا!

اس دلِ دیوانہ پر میں ہوں فدا — مجھکو ہر دم بخشتے ویرانہ نیا
گر رکوں، کہتا ہے مجھ سے رک نہ تو — بحرِ بھی عارف کو ہے اک آبجو
چونکہ ہیں آیاتِ حق لا انتہا — راہِ حق کی انتہا کب ہو بھلا
کارِ حکمت دیکھنا اور جاننا — کارِ عرفاں دیکھنا پہچاننا
اس کی ہے میزان، میزانِ ہنر — اس کی ہے میزان، میزانِ نظر
اس کا حاصل نقشِ آب و خاک ہے — اس کا حاصل نورِ جانِ پاک ہے

آنکھ صرف اُس کی تجلی پر پڑے!
یہ تجلی اپنی جاں میں گم کرے

ہے تلاشِ جلوہ ہائے پے بہ پے
کر رہا ہوں منزلِ افلاک طے

ہوں رہینِ فیضِ مردِ پاک ذات
جس نے بخشا ہے مجھے سوزِ حیات

دونوں ہم اہلِ نظر تھے ہم سفر
جا کے اترے مشتری کی خاک پر

وہ جہاں، وہ خاکدانِ ناتمام
گرد جس کے ماہ ہائے تیز گام

مے سے خالی اس کی ہے مینائے تاک
بے نہالِ آرزو ہے اس کی خاک

نیم شب تھی تابِ مہ سے نیم روز
خنکی تھی اس کی ہوا میں اور نہ سوز

میں نے ڈالی سوئے گردوں جب نظر
اس کا کوکب پایا کچھ نزدیک تر

زَرد و دُرد اس جا دگرگوں ہو گئے
دیکھ کر یہ ہوش میرے کھو گئے

سامنے تھیں تین روحیں پاکباز
جن کا سوزِ سینہ ہے گیتی گداز

حلّہ ہائے لالہ گوں پہنے ہوئے
سوزِ جاں سے چہرے تھے دہکے ہوئے

روح میں ان کی نہاں شورِ "الست"
اپنے نغموں میں سدا رہتے ہیں مست

"تو نہ یوں بیخود رہو" رومی نے کہا
"زندگانی بخش ہے، ان کی نوا

شوقِ بے پروا نہیں دیکھا تو دیکھ
کیف اس مے کا نہیں دیکھا تو دیکھ

غالب[184] و حلّاج[185] و خاتونِ عجم[186]
ان سے ہی پُر شور ہے جانِ حرم

روح کو ان کی نوا بخشے ثبات
اس نوا میں سوزِ قلبِ کائنات

نوائے حلّاج

کر خاک سے اپنی ہی طلب آتشِ جلوہ
مت کر تو سرِ طور تجلّی کا تقاضا
ہر پھول میں، ہر ذرہ میں ہے جلوۂ جاناں
میں خود میں فنا یوں ہوں، نہیں ہوشِ تماشا
دیں سلطنتِ جم بھی مجھے، دوں نہ یہ مصرع
جو جاں نہ لٹائے نہیں ہم کیش وہ اپنا
گو لاکھ ہو یہ عقلِ فسوں ساز صف آرا
تو حوصلہ مت ہار، نہیں عشق بھی تنہا
تجھ کو ہے خبر خود کی نہ ہے اپنے جہاں کی
ہے سازِ سلیمیٰ میں ہر اک نغمۂ تازہ
کہہ مجھ سے فقط صیدِ نہنگاں کی حکایت
مت کہہ کہ مری کشتی نہیں محرمِ دریا
ہے صاحبِ ہمت وہی رکھے نہ قدم جو
اس راہ میں جس میں ہو کوئی دشت نہ دریا

آ حلقۂ رنداں میں لگا منہ سے لبِ جام
مت اس کو لگا منہ، جو نہیں صاحبِ غوغا

—

نوائے غالب

آ جا کہ بدل ڈالیں، یہ رسم و رہِ دوراں
ہو گردشِ ساغر ہی سے تقدیر کا درماں
دھتکار دیں، ہو شحنہ[۱۶۸] اگر درپے آزار
لوٹا دیں، اگر پہنچے ہمیں ہدیۂ شاہاں
موسیٰ جو مخاطب ہوا اُسے منہ نہ لگائیں
ہم وا نہ کریں در کو خلیل آئے جو مہماں
ہم دور رکھیں رعب سے گلچیں کو چمن سے
محفوظ رکھیں آبرو سے نظمِ گلستاں
لوٹا دیں بڑے پیار سے کاشانوں میں انکو
آ جائیں جو مرغانِ سحر، بال فشاناں
ہم[۱۶۹] بندۂ حیدر ہیں نہیں ہم سے عجب کچھ
لوٹا دیں سوئے شرق اگر مہرِ درخشاں

نوائے طاہرہ

گر مجھے آئے تو نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو
دل کی کہوں میں داستاں نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
اک تری دید کے لیئے بن کے فقیر ہم پھرے
خانہ بخانہ در بدر، کوچہ بہ کوچہ کو بکو

،ہجر میں تیرے جانِ جاں خون کے اشک ہیں رواں
دجلہ بدجلہ یم بہ یم[190] چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو
دل نے تمہاری چاہ کو جامۂ جاں میں یوں بُنا
رشتہ برشتہ، نخ بہ نخ[191]، تار بہ تار، پو بہ پو[192]
مصحفِ دل میں طاہرہ! پائے نہ کچھ ترے سوا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو

سوز و سازِ عاشقانِ دردمند — کر گیا جوشِ جنوں سے بہرہ مند
مشکلاتِ کہنہ نے یلغار کی — فکر بہکا، عقل بھی عاجز ہوئی
فکر کے دریا میں آیا اضطراب — یوں اٹھا طوفاں، ہوا ساحل خراب
رومی بولا ہاتھ سے موقع نہ دے — چاہتا ہے جو تُو ان سے پوچھ لے
سوچ میں غلطاں رہے گا کب تلک
اس قیامت کو سہے گا کب تلک

زندہ رود اپنی مشکلات ارواحِ جلیلہ کے سامنے بیان کرتا ہے

مومنانِ پاک سے دوری ہے کیوں؟
یعنی جنت سے یہ مہجوری ہے کیوں؟

حلّاج

مردِ حُر جو جانتا ہے خوب و زشت — روح کو اس کی ہے اک زنداں بہشت
جنّتِ ملّا، مے و حور و غلام — جنّتِ احرار ہے سیرِ دوام

جنتِ مُلّا خور و خواب و سرود   جنّتِ عشاق ہے سیرِ وجود
۱۹۴ حشرِ مُلّا شقِ قبر و بانگِ صور   عشق شور انگیز ہے صبحِ نشور
علم کی بیم و رجا پر ہے اساس   عشق لیکن بے امید و بے ہراس
علم مرعوبِ جلالِ کائنات   عشق ہے محوِ جمالِ کائنات
حال و ماضی پر نگاہِ علم ہے گر   عشق بولے دیکھو جو آئے نظر
علم ہے وابستۂ آئینِ جبر   اس کا چارہ کچھ نہیں جز جبر و صبر
عشق آزاد و غیور و ناصبور   ہے تماشا گاہِ عالم میں جسور
عشق اپنا شکووں سے بیگانہ ہے   گریہ اپنا، گریۂ مستانہ ہے
۱۹۵ یہ دلِ مجبور ہے، مجبور کب!   ناوک اپنا ہے نگاہِ حور کب!
شعلہ ہائے شوق بھڑکائے فراق   راس اپنی جان کو آئے فراق
بے خلش جینا بھی کیا جینا بھلا   گر ہے جینا رہیے آتشِ زیرِ پا
اس طرح جینا ہے تقدیرِ خودی   اس سے ہی ہوتی ہے تعمیرِ خودی
شوق ہی سے ذرّہ بھی ہے رشکِ مہر   اس کے سینے میں سمائیں نُو سپہر
شوق جب عالم پہ ہو حملہ کناں
مردِ فانی کو بنا دے جاوداں

زندہ رود

گردشِ تقدیر ہے مرگ و بقا
گردشِ تقدیر، خود آخر ہے کیا؟

حلّاج

ڈھل گیا جو ساز میں تقدیر کے   اس سے ابلیس و اجل لرزاں ہوئے

دینِ[۱۹۶] مردِ صاحبِ ہمت ہے جبر   یوں کمالِ قوت و طاقت ہے جبر

پختہ تر پختہ کو کر دیتا ہے جبر   جبر، مردِ خام کو آغوشِ قبر

جبرِ خالدؓ اک جہاں برہم کرے   اور ہمارا جبر، جاں برہم کرے

شیوہ ہے مردوں کا تسلیم و رضا   یہ ضعیفوں کو نہیں لیکن روا

جانتا ہے تو مقامِ پیرِ روم   کیا پڑھا ہے یہ کلامِ پیرِ روم

"بایزیدِ مردِ حق کا دور تھا
اک مجوسی سے مسلماں نے کہا
خوب ہو ایماں تو لے آئے اگر
تاکہ ہو انعامِ حق سے بہرہ ور
بولا، گر یہ ہے وہ ایماں اے مرید!
جو ہے ایمانِ جنابِ بایزیدؒ
مجھ میں اس ایمان کی طاقت کہاں
کب اٹھا سکتا ہوں وہ بارِ گراں"

(رومی)

کام اپنا بس امید و بیم ہے   کب ہر اک کو ہمتِ تسلیم ہے

تو جو کہتا ہے یہ ہونا تھا، ہوا   ہر عمل پابند ہے آئین کا

معنیِ تقدیر کو سمجھا نہیں   سرِّ حق، رازِ خودی پایا نہیں

پیشِ حق کرتا ہے مومن التجا   "ہوں ترا طالب، تو بن طالب مرا"

عزم اس کا، خالقِ تقدیرِ حق
جنگ کے دن، تیر اس کا، تیرِ حق ۱۹۷

زندہ رود

کم نگاہوں نے کیے فتنے بپا — مردِ حق کو دار پر لٹکا دیا
کچھ تو کہیے آپ کیوں ایسا ہوا؟ — کیا تھی آخر آپ کی ایسی خطا؟

حلّاج

زندگانی بخش تھی میری صدا — اور ملّت تھی رواں سوئے فنا
مومنوں کی طبع میں تھی کافری — لا الٰہ کہہ کر بھی انکارِ خودی ۱۹۸
نقشِ باطل جاں کو بتلایا گیا — آب و گل سے اس کو وابستہ کیا
میں نے روشن خود میں کی نارِ حیات — مُردوں کو بتلائے اسرارِ حیات
کر کے یکجا دلبری و قاہری — کی خودی نے پیدا اک دنیا نئی
ہر جگہ ظاہر ہے، پنہاں ہے خودی — کب نظر اس برق پر ٹھہرے کوئی
زندگی میں سوز اس کے نور سے — جلوۂ ہستی ہے اس کے طور سے
دہر میں درپردہ ہر دل ہر گھڑی — کر رہا ہے ذکرِ انعامِ خودی
جو نہ اس کا نور حاصل کر سکا — وہ جہاں میں خود سے بیگانہ مرا
واقف اس کے نور سے ہند و عجم — واقف اس کے سوز سے ہیں لوگ کم
میں نے بتلایا تھا رازِ نار و نور — بندۂ محرم یہ تھا میرا قصور!

جو کیا میں نے وہی تو نے کیا
ڈر، کہ تو نے بھی کیا محشر بپا

طاہرہ

بندۂ صاحب جنوں کا اک گناہ — کھولتا ہے اک نئے عالم کی راہ!
پردہ در ہوتا ہے شوقِ اسرار کا — بخشتا ہے حسن کو جلوہ نیا
حصہ پاتا ہے صلیب ودار سے — زندہ کب لوٹا ہے کوے یار سے
کوہ ودشت وشہر اس سے جلوہ گر — ثبت نقش اس کا دلِ ایام پر
دل میں وہ اپنے زمانے کے نہاں
وہ کہاں اور یہ بھلا خلوت کہاں!

زندہ رود

اے کہ ذوقِ جستجو تجھ کو ملا — اپنے اس اک شعر کے معنی بتا
"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟"

غالب

نالہ وہ جس میں ہو سوزِ جگر — ہر جگہ دیکھا نیا اس کا اثر
قمریوں نے سوزِ دل اس سے لیا — بلبلوں نے رنگ روپ اس سے چنا
موت اس میں ہے، ہم آغوشِ حیات — اک نفس اِس جا حیات، اُس جا ممات
رنگ ایسا جس سے ارژنگی[199] کی شان — رنگ ایسا جو ہے بیرنگی کی جان
ہے یہ ناداں! اک مقامِ رنگ و بو — قسمتِ ہر دل بقدرِ ہاؤ ہو
رنگ بن، یا رنگ کو تو چھوڑ جا — تاکہ ہو سوزِ جگر سے آشنا

زندہ رود

صد جہاں رکھتی ہے یہ نیلی فضا
کیا وہاں ہیں اولیا و انبیا؟

غالب

۲۰۰ ہے عجب یہ کائناتِ ہست و بود — پا رہے ہیں نت نئے عالم وجود
زندگانی کا ہے ہنگامہ جہاں — "رَحمۃٌ لِلّعالمیں" بھی ہے وہاں

زندہ رود

صاف کہہ، ہے فہم میری نارسا!

غالب

اس سخن کو صاف کہنا ہے خطا

زندہ رود

حرفِ اہلِ دل ہے بے حاصل بہت!

غالب

نکتہ لب پہ لانا ہے مشکل بہت!

زندہ رود

گرچہ گردوں گیر ہے تیری زمیں
پر سخن گوئی پہ تو غالب نہیں

غالب

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا [۲۰۱]
رحمۃ للعالمینی انتہا

زندہ رود

اس کے معنی ہیں نہ اب تک پا سکا
آگ رکھتا ہے اگر، ہمکو جلا!

غالب

اے کہ ہے میری طرح دانائے فن — سمٹے ظرفِ شعر میں کب یہ سخن
بنتے ہیں بزمِ سخن کے جو ندیم — بے یدِ بیضا ہیں یہ سارے کلیمؑ
مجھ سے کرتا ہے طلب تو کافری — کافری ہے ماورائے شاعری

حلاّج

ہے جہاں بھی کارگاہِ رنگ و بو — پھول مہکائے جہاں بھی آرزو
ہے وہ نورِ مصطفیٰؐ سے مستنیر — یا تلاشِ مصطفیٰؐ میں جادہ گیر

زندہ رود

پوچھتا ہوں، پوچھنا گو ہے خطا — کچھ بتا اسرارِ نورِ مصطفیٰؐ
آدمی ہے یا سراپا ہے وہ نور — گاہے گاہے جس کا ہوتا ہے ظہور

حلّاج

سامنے ہے اس کے عالم سرنگن — عبدہٗ ہے اور ہے شاہِ زمن
عبدہٗ ہے، فہمِ انساں سے بلند[۲۰۲] — آدمی ہے اور نورِ ارجمند
کب عرب میں یا عجم میں ہے مقیم — آدمی ہے آدمی سے بھی قدیم
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہے — اس میں ویرانہ بھی اک تعمیر ہے
عبدہٗ ہے جانفزا اور جاں ستاں — ہے وہی شیشہ وہی سنگِ گراں
عبد، عامی، عبدہٗ عالی صفات — مُنتظِر ہم، مُنتظَر اسکی ہے ذات
عبدہٗ دنیا ہے، دنیا عبدہٗ — ہم سراپا رنگ، وہ بے رنگ و بو
کائناتِ عبدہٗ بے انتہا — اس کو صبح و شام سے کیا واسطہ
کون اس کے راز سے آگاہ ہے — عبدہٗ بس سرِّ الّا اللہ ہے
لا الٰہ ہے پھول، خوشبو عبدہٗ — صاف کہہ دوں صاف کہہ، ہُو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات — عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
بات کب واضح کریں گے یہ دو بیت — تو نہ سمجھے گر مقامِ "مارمیت"[۲۰۳]

چھوڑ یہ گفت و شنود، اے زندہ رود!
اور ہو محوِ وجود، اے زندہ رود!

—

زندہ رود

عشق کیا ہے؟ دل کا کاروبار کیا؟
ہے جو ذوقِ دید، پھر دیدار کیا؟

حلّاج

معنیِ دیدِ سِرِّ آخر زماں! اس کی سنّت کو بنانا حکمراں!
کر تو تقلیدِ رسولِؐ انس و جاں تاکہ تو بھی ہو قبولِ انس و جاں
خود کو پھر دیکھ، اسؐ کا یہ دیدار ہے
اس کی سنّت، حاصلِ اسرار ہے

زندہ رود

کیا ہے دیدارِ خدائے نہ سپہر
جس کے تابع آسمان و ماہ و مہر

حلّاج

اپنے دل میں نقشِ حق پہلے بٹھا پھر اسے سارے جہاں پر تو جما
جب جہاں میں نقشِ جاں ہوگا تمام ہو گا پھر دیدارِ حق، دیدارِ عام
خوب ہے وہ مرد جس کی ایک ہُو رقص میں لائے جہانِ کاخ و کُو
حیف وہ درویش جس نے ہُو کہا روک کر پھر سانس کو چپ ہو گیا
اس کا حکم اس دہر میں جاری نہیں نانِ جَو ہے پاس، کرّاری نہیں

چھوڑا خیبر، خانقہ میں جا بسا　　ترک کی سلطانی، راہب بن گیا
نقشِ حق ہو پاس، دنیا ہے شکار　　ہو تری تدبیر کی تقدیر یار

عصرِ حاضر تجھ سے ہے جنگ آزما
دل میں اس کافر کے نقشِ حق بٹھا

زندہ رود

اس جہاں میں نقشِ حق قائم ہوا
نقشِ حق کیسے ہوا قائم، بتا

حلّاج

یا بزورِ دلبری قائم ہوا　　یا بزورِ قاہری قائم ہوا
دلبری ہے نورِ حق سے بہرہ ور　　دلبری سے قاہری ہے خوب تر

زندہ رود

کچھ بتا اے صاحبِ اسرارِ شرق!
زاہد و عاشق میں کیا ہوتا ہے فرق؟

حلّاج

صاحبِ زہد، اجنبی دنیا میں ہے
صاحبِ عشق، اجنبی عقبیٰ میں ہے

—

زندہ رود

انتہا عرفاں کی ہے ہونا فنا
کیا فنا ہی میں مزا ہے زیست کا؟

حلّاج

۲۰۴ سکرِ یاراں ہے تہی پیمانگی — ہے فنا عرفان سے بیگانگی
تو فنا میں ڈھونڈ مت مقصود کو — پا نہیں سکتا عدم موجود کو

زندہ رود

۲۰۵ خود کو برتر جس نے آدم سے کہا — جام اس کا بادہ سے خالی رہا!
مشتِ خاک اپنی ہے گردوں آشنا — آگ اس بے چارے کی ہے کس جگہ؟

حلّاج

۲۰۶ کیا کہوں وہ خواجۂ اہلِ فراق — وہ ازل سے تشنہ لب، خونیں ایاق
ہم تھے جاہل اور وہ دانائے کُل — کفر سے اس کے گیا سب راز کھُل
ہے تزبّل میں ترقی کا نشاں — بن اندھیرے روشنی ہوتی کہاں

ق

۲۰۸ عشق اس کی آگ میں جلنے کا نام — آگ اس کی گر نہ ہو، جلنا حرام
عشق اور خدمت میں ہے وہ کہنہ تر — آدم اس کے راز سے ہے بے خبر

چاک کر پیراہنِ تقلید کو!
تاکہ اس سے سیکھ لے توحید کو!

زندہ رود

اے کہ تو ہے حکمرانِ ملکِ جاں
اور تھوڑی دیر تو رک جا یہاں!

حلّاج

ہم نہیں کرتے کبھی اک جا مقام — ہے ہمیں بس ذوقِ پروازِ مدام
سوزِ شمعِ طورِ سینا ہر گھڑی — بے پر و بال اڑتے رہنا ہر گھڑی

خواجۂ اہلِ فراق ابلیس کا نمودار ہونا

صحبتِ روشندلاں ہے یک دو دم — ہے وہ دم سرمایۂ بود و عدم
عشق کو شوریدہ تر کر کے گیا — عقل کو صاحب نظر کر کے گیا
آنکھ بند کی تاکہ اس کو پا سکوں — راہ سے آنکھوں کی دل میں لا سکوں
ناگہاں تاریکی ہر سُو چھا گئی — تھی مکاں سے لامکاں تک تیرگی
تیرگی میں ایک شعلہ سا اٹھا — رونما اک پیرِ مرد اس سے ہوا
اک قبائے سرمئی پہنے ہوئے — دودِ پیچاں اپنے پہلو میں لیے

رومی بولا "اے سراپا اشتیاق!
ہے یہ بوڑھا خواجۂ اہلِ فراق!

خشک طبع و کہنہ سال و کم سخن — دیکھ لے اس کی نظر، روحِ بدن
رند بھی، ملّا بھی ہے یہ خرقہ پوش — اور عمل میں مثلِ زاہد سخت کوش
اس کا دل بیگانۂ ذوقِ وصال — زہد اس کا ترکِ حسنِ لایزال
حسن سے ہونا جدا آساں نہ تھا — ترکِ سجدہ نے یہ کام آساں کیا
دیکھ اس کے جذبِ دل کی واردات — دیکھ اس کی مشکلات، اسکا ثبات

ہے ابھی تک محوِ رزمِ خیر و شر
سو پیمبر دیکھے، ہے کافر مگر

اس کے سوزِ غم سے میرا دل جلا — آہ پُرلب غم سے وہ خود بھی ہوا
نیم وا نظروں سے دیکھا اور کہا — "کس کو تھا جوشِ عمل میرے سوا
میں یوں مصروفِ عمل پیہم رہا — جمعہ کے دن بھی، میں فارغ کم رہا
میں ہوں کب جبریل کا محتاج ہی — وحی بھی آتی ہے مجھ پر بے نبی
میں نہیں رکھتا ہوں قرآن و زبور — میں فقیہوں سے رہا کرتا ہوں دور
حالِ مذہب ان فقیہوں سے ہے زار — ہے غلافِ کعبہ ان سے تار تار
میرے مذہب کی روایت تابناک — مذہبِ ابلیس ہے فرقوں سے پاک
کیوں کسی کے آگے خم ہو میرا سر — میں نے ڈھالا ہے نظامِ خیر و شر
میں خدا کی ذات کا منکر نہیں — یہ حقیقت ہے کہ میں کافر نہیں
دیکھ کر اس کو، ہوں منکر، ہے عجب — ہست کو میں نیست کہہ سکتا ہوں کب؟
"لا" کے پردے میں "بلیٰ" میں نے کہا — ہے نہ کہنے سے بھلا کہنا مرا
دردِ آدم میرے دل میں تھا مکیں — قہرِ یار اس کے لیے چھوڑا نہیں
بن گئی اک شعلہ میری کشتِ زار — جبر سے آدم نے پایا اختیار
تجھ کو دے کر ذوقِ جبر و اختیار — میں نے کی اپنی برائی آشکار

۲۰۹

مجھکو تو آزاد کر اس آگ سے — کر یہ کام آسان، میرا ساتھ دے
تو کہ میرے جال میں ایسا پھنسا — ہر گُنہ میرے اشارے سے کیا
دہر میں کچھ تو ذرا مردانہ جی — مجھ سے اے غم خوار تو بیگانہ جی!
میرے نیش و نوش کی پروا نہ کر — کر نہ میرا نامہ یوں تاریک تر
ہو نہ کیوں صیاد، اگر نخچیر ہے — صید تُو ہے، پاس میرے تیر ہے
صاحبِ پرواز گرتا ہے کہیں
صیدِ زیرک دام میں آتا نہیں

"چھوڑ دے" میں نے کہا "رسمِ فراق" — اَبْغَضُ الْاَشْیَاءِ عِنْدِی الطَّلَاق"
بولا "سازِ زیست ہے سوزِ فراق" — ہے عجب سرمستیِ روزِ فراق
میرے لب محرومِ حرفِ وصل ہیں — وصل چاہوں تو رہے گا "وہ" نہ "میں"
مجھ سے جونہی ذکرِ وصل اس نے سنا — اس کے دل میں درد و غم تازہ ہوا
وہ دھوئیں میں اپنے کچھ تڑپا ذرا — گم پھر اپنے ہی دھوئیں میں ہو گیا
اس دھوئیں سے اک ہوا نالہ بلند
خوب ہے وہ جان، جو ہے درد مند

نالۂ ابلیس!

اے خداوندِ صواب و ناصواب! — صحبتِ آدم ہے مجھ کو اک عذاب!
یہ سدا میرے اشارے پر چلا — اور خودی سے اپنی بیگانہ رہا!
اس کی فطرت میں نہیں ذوقِ "اِبا" — ہے یہ محرومِ شرارِ کبریا
صید خود خواہاں کہ ہو جائے اسیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر!
مجھ کو ایسے صید سے آزاد کر — کچھ تو میری پچھلی طاعت یاد کر

پست اس سے ہمتِ والا مری
فطرت اس کی خام، عزم اس کا ضعیف
بندۂ صاحب نظر مجھ کو ملے
آب و گل کے یہ کھلونے مجھ سے لے
ابنِ آدم کیا ہے بس اک مشتِ خس
اس جہاں میں گر نہ تھا خس کے سوا
شیشہ کو پگھلانا وجہِ ننگ و عار
ان فتوحاتِ مسلسل سے ہوں تنگ
اپنا منکر چاہتا ہوں اے خدا!
ایسا بندہ جو جھکا دے میرا سر
"دور ہو نظروں سے" جو مجھ سے کہے
پیدا کر یارب وہ مردِ حق پرست
میں بھی چکھوں لذتِ دردِ شکست!

ہے سراپا درد میری زندگی!
یہ نہیں اک ضرب کا میری حریف
اک حریفِ پختہ تر مجھ کو ملے
کودکی پیری میں کیا کوئی کرے
مشتِ خس کو اک شرر میرا ہے بس
آگ مجھ کو اتنی کیوں دی تھی بھلا!
سنگ کو پگھلانا وجہِ افتخار
مجھ کو ہیں یہ باعثِ صد عار و ننگ
مجھ کو اُس مردِ خدا کا دے پتا
مجھ کو لرزاں کر دے جس کی اک نظر
قدر میری کچھ نہ ہو جس کے لیے

۲۱۲ فلکِ زحل

ارواحِ رذیلہ، جنہوں نے ملک و ملّت سے غدّاری کی — اور دوزخ نے بھی جنہیں قبول نہ کیا!

پیرِ رومی وہ امامِ راستاں
بولا "اے گردوں نوردِ سخت کوش!
وہ جو شے گردِ کمر پیچیدہ ہے

جانتا ہے جو مقامِ راستاں
دیکھ وہ ہے عالمِ زنّار پوش
دُم کسی سیّارہ کی دُزدیدہ ہے

سست سیر ایسا کہ وہ ساکن لگے — خوب ہے ناخوب اس کے حکم سے
آب و گل سے گو وجود اس کا تمام — اس پہ رکھنا ہے قدم دشوار کام
روزِ اوّل سے فرشتے صد ہزار — دیر ہے ہیں برق کے کوڑوں کی مار
اس پہ پیہم پڑتے ہیں دُرّے ہزار — قہرِ حق کا ہے وہ سیّارہ شکار
اک جہاں مطرود[۲۱۳] و مردودِ سپہر — دن ہے اس کا مثلِ شب بے نورِ مہر
اس میں رہتی ہیں وہ ارواحِ فضول — جن کو دوزخ بھی نہیں کرتی قبول
اس میں رہتے ہیں دو طاغوتِ کہن[۲۱۴] — قاتلِ ملّت بنے بہرِ دو تن
جعفر از بنگال و صادق از دکن![۲۱۵] — ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
نامقبول و ناامید و نامراد — بو گئے ملّت میں وہ تخمِ فساد
جس کا تھا اقوامِ عالم میں وقار — آج دنیا میں وہی ملّت ہے خوار
تو نے دیکھا خطۂ ہندوستاں — وہ عزیزِ خاطرِ صاحبدلاں
جس کا پیر اک خطہ ہے عالم فروز — خاک و خوں میں وہ تڑپتا ہے ہنوز
اس کی فطرت میں غلامی بس گئی — ہے یہ سب کرتوت ان ارواح کی

اُس فضائے نیلگوں میں رک ذرا!
اور مکافاتِ عمل بھی دیکھ جا!

قلزمِ خونیں[۲۱۶]

منظر ایسا خوف ناک آیا نظر — جس کی دہشت سے لرز اٹھا جگر
میں نے دیکھا سامنے اک بحرِ خوں — جس میں تھا طوفاں بروں طوفاں دروں
سانپ تھے اڑتے ہوئے مثلِ نہنگ — کالے پھن اور بال و پر سیماب رنگ
چیختی تھیں موجیں مانندِ پلنگ — جاں بلب تھے جن کی ہیبت سے نہنگ

موجیں ساحل کو نہ دیتی تھیں اماں　　خوں میں گرتی تھیں چٹانیں ہر زماں
موج ٹکراتی تھی باہم موج سے　　ان میں اک کشتی نظر آئی مجھے
کشتی میں دو آدمی تھے زرد رُو
دونوں تھے عریاں بدن آشفتہ مُو

رُوحِ ہندوستان نمودار ہوتی ہے

دُور افق پہ ایک حور آئی نظر　　روشن اس کا چہرہ مانندِ سحر
اس کی پیشانی پہ نورِ لایزال　　اس کی آنکھوں میں سرورِ لایزال
اور لباس اس کا تھا مانندِ سحاب　　تار و پود اس کا رگِ برگِ گلاب
حسن ایسا اور اس پر طوق و بند　　اس کے لب پر نالہ ہائے دردمند
"ہے یہ روحِ ہند" رومی نے کہا
"کتنی درد انگیز ہے اس کی نوا"

روحِ ہندوستان نالہ و فریاد کرتی ہے

بے چراغ و نور ہے فانوسِ ہند　　ہندی ہے بیگانۂ ناموسِ ہند
ذات سے اپنی نہیں جو آشنا　　کام وہ دنیا میں کر سکتا ہے کیا
ماضیِ مرحوم پر اس کی نظر　　سرد شعلوں سے جلاتا ہے جگر
ہے وہ میری روسیاہی کا سبب　　ہے وہی میری تباہی کا سبب
اس کو احساسِ خودی جاتا رہا　　کہنہ رسموں میں مقیّد ہو گیا

آدمیت اس سے ہے اندوہگیں
دہر میں کوئی مقام اس کا نہیں

فقر وہ کیا جس سے عریانی ملے — فقر وہ ہے جس سے سلطانی ملے[218]
قہرِ حق ہے جبر ہو یا خوبے صبر — صابر و مجبور کو ہے زہر جبر
اک اگر ہوتا ہے خوگر صبر کا — دوسرا ہوتا ہے خوگر جبر کا

دونوں کا ذوقِ ستم ہو گا فزوں
میرا دکھ "یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ"[219]

ہند کی یہ رات جانے کب ہو روز — روحِ جعفر اس میں زندہ ہے ہنوز
ایک تن کی قید سے گر ہو رہا — دوسرے تن میں بنا لیتی ہے جا
ہے کلیسا سے کبھی کچھ ساز باز — ہے کبھی وہ دیر میں محوِ نیاز
اس کا مذہب ہے فقط سوداگری — ہے لباسِ حیدریؓ میں عنتری[220]
جس طرف بدلی زمانے کی ہوا — اس طرف ہی اس کا رخ بھی ہو گیا
پہلے کوئی اور تھا اس کا خدا — اب وطن لیکن خدا اس کا بتا
ہے غمِ دیں میں بظاہر درد مند — وہ بباطن ہے مگر زنّار بند
روحِ جعفر جس بدن میں ہو نہاں — ہے وہی غدّارِ ملّت، بے گماں
لاکھ وہ ہنس کر ملے، پر کب ہے یار — مار اگر خنداں بھی ہو پھر بھی ہے مار
وحدتِ قومی ہوئی اس سے دو نیم — اور ملّت اس کے دم سے ہے لئیم
کوئی بھی غدار جب پیدا ہوا — نام اس کو صادق و جعفر ملا

اک بلا ہے روحِ جعفر اے خدا!
جعفرانِ عصرِ حاضر سے بچا!

—

قلزمِ خُونیں کے کشتی نشینوں میں سے ایک کی فریاد

ہے عدم اپنا نہ پہنائے وجود — ہائے یہ بے مہریِ بود و نبود
چھوڑ کر جب ہم جہانِ شرق و غرب — در پہ دوزخ کے گئے با دردِ کرب
اس نے رکھی آگ اپنی ہم سے دور — صادق و جعفر سے تھی، دوزخ نفور

بولی دوزخ، دونوں تم غدّار ہو
جاؤ ناپاک، آگ میری مت کرو

ہم گئے پھر ماورائے آسماں — اور پہنچے پیشِ مرگِ ناگہاں
موت بولی، جاں ہے اک سرِّ نہاں — کام میرا ہدمِ[۲۲۱] تن اور حفظِ جاں
گرچہ بے قیمت ہے، جانِ بد ہے جو — ہدمِ جاں تو چاہتا ہے، دور ہو!

موت سے یہ کام ہو سکتا نہیں
چین سے غدّار[۲۲۲] سو سکتا نہیں

اے ہوائے تند! اے دریائے خوں! — اے زمیں! اے آسمانِ نیلگوں!
اے نجوم! اے آفتاب! اے ماہتاب! — اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب!
شاطرانِ غرب! شاہانِ فرنگ! — اے کہ تم فاتح بنے بے رزم و جنگ!

اس جہاں میں، جو ہے بے حدّ و کراں
بندۂ غدّار کا مولا کہاں؟

ناگہاں آئی صدائے ہولناک — ہو گیا صحرا کا سینہ چاک چاک!
ربطِ اجزائے بدن جاتا رہا — کوہ سے کُہ پارہ ٹکرا کر گرا

کوہ تھے مثلِ سحاب اندر مرور — اک قیامت تھی بپا بے بانگِ صور
آسمانوں پر کڑکتی بجلیاں — بحرِ خوں میں ڈھونڈتی تھیں آشیاں
ہو گیا تھا گویا موجوں کو جنوں — کر دیا تھا دشت و در کو غرقِ خوں

دیکھ کر یہ منظرِ وحشت اثر
بے نیازی سے گئے تارے گذر

افلاک کے اُس پار

جرمنی کے فلسفی نطشے[۱۲۳] کا مقام

زیست کی ہے جنگ ہر جا تیز تر — رازِ گردوں سے ہیں سب ہی بے خبر
موت بھی ہے ایک پیغامِ بقا — جانتا ہے مردِ حق رازِ فنا
ہر جگہ مثلِ ہوا ارزاں حیات — بے ثبات و با تمنائے ثبات
میں نے دیکھے صد جہانِ شش جہات — تب نظر آئیں حدودِ کائنات
ہر جہاں کے ماہ و پروین اور ہیں — زندگی کے رسم و آئیں اور ہیں
ہر جگہ ہے وقت کا دریا رواں — تیز رو اُس جا ہے آہستہ یہاں
سال اِس جا کا وہاں کا ایک دم — اُس جہاں کا بیش اس عالم کا کم

عقل اپنی اِس جہاں میں ذو فنوں
دوسرے عالم میں ہے خوار و زبوں

سرحدِ عالم پہ دیکھا ایک مرد — تھی صدا جس کی سراپا سوز و درد
تیز تھی شاہیں سے بھی اس کی نظر — اس کا چہرہ شاہدِ سوزِ جگر

دردِ دل سے ہو رہا تھا بے قرار　　پڑھ رہا تھا شعر یہ وہ بار بار

نہ جنت ہے نہ دوزخ ہے نہ شیطاں ہے نہ یزداں ہے
فقط سوزِ تمنّا سے تڑپتا ایک انساں ہے

میں نے پوچھا کون ہے یہ آدمی؟　　رومی بولا "یہ ہے جرمن فلسفی

دو جہاں کے درمیاں اس کی جگہ　　نغمۂ دیرینہ ہے اس کی نوا

پھر سے یہ حلاجِ بے دار و رسن[۲۲۴]　　طرزِ نو سے کہہ گیا حرفِ کہن!

بات میں بے باک، دانش میں عظیم　　اہلِ مغرب اس کی باتوں سے دو نیم

پا سکا اس کے نہ جذبے کو کوئی　　سمجھے اس مجذوب کو مجنوں سبھی

عقل والے عشق سے تھے بے نصیب　　وہ اسے لے کر گئے پیشِ طبیب

مکر کرنا ہے طبیبوں کا شعار　　مغربی مجذوب کا ہے حالِ زار

ابنِ سینا نیند کی گولی تو دے　　وہ علاجِ دردِ دل کب کر سکے

اجنبی اپنوں میں یہ حلاج تھا
دَیر نے مارا جو ملّا سے بچا

مردِ رہ داں کوئی مغرب میں نہ تھا　　نغمہ اس کا ساز سے افزوں ہوا

جب نہ سالک کو کوئی مرشد ملا　　نقص اس کی وارداتوں میں پڑا

نقد تھا لیکن نہ وہ پرکھا گیا　　راہرو[۲۲۵]، محرومِ رہبر ہی رہا

تھا وہ عاشق گُم خود اپنی آہ میں　　تھا وہ سالک گُم خود اپنی راہ میں

ٹکڑے ٹکڑے اس نے ہر شیشہ کیا　　تھا وہ خود سے اور خدا سے بھی جدا

اس نے ربطِ قاہری و دلبری　　دیکھنا چاہا بچشمِ ظاہری

چاہتا تھا چھوڑ کر یہ آب و گل　　وہ بنے اک غنچۂ گلزارِ دل

ڈھونڈتا تھا وہ مقامِ کبریا　　عقلِ انسانی سے ہے جو ماورا

چاہتا تھا وہ کہ دیکھے آدمی! — اس کا نعرہ تھا کہاں ہے آدمی؟
زیست ہے شرحِ اشاراتِ خودی — لا و الّا ہیں مقاماتِ خودی
رہ گیا لا میں، نہ الّا تک گیا — عبدہٗ سے یوں وہ بیگانہ رہا
تھی تجلی پاس، پر وہ بے خبر — جیسے میوہ بیخ سے ہو دُور تر
خاکیوں سے ورنہ وہ بیزار تھا — مثلِ موسیٰ طالبِ دیدار تھا

ق

کاش پاتا شیخِ احمدؒ[۲۳۶] کا زماں — تاکہ حاصل اس کو ہوتا نورِ جاں
خود سے عقل اس کی ہے محوِ گفتگو — راہ اپنی نیک ہے چل اس پہ تو
رکھ قدم آگے کہ آیا وہ مقام
"جس جگہ بے حرف ہوتا ہے کلام"

جنّت الفردوس کی سیر!

چھوڑیں جب میں نے حدودِ کائنات — سامنے پایا جہانِ بے جہات
یہ جہاں ہے بے یمین و بے یسار — اس کی دنیا میں نہیں لیل و نہار
بجھ گیا تھا میری دانش کا دیا — ہیبتِ معنی سے میں گونگا ہوا
کب زبانِ گل سے ہو گفتارِ جاں
لذتِ پرواز، زنداں میں کہاں

دل کی دنیا پر ذرا ڈال اک نظر — تاکہ نورِ جاں سے ہو روشن بصر
کیا ہے دل اک عالمِ بے رنگ و بو — عالمِ بے رنگ و بو، بے چار سُو
دل کی دنیا، ساکن و سیّار بھی — عالمِ احوال بھی، افکار بھی

عقل ہے تدریج ہی سے نکتہ داں　　بے رہ و رفتار و جنبش ہے رواں
سو خیال اک دوسرے سے سب جدا　　ایک گردوں آشنا اک نارسا
گر کوئی ہے فکر، گردوں آشنا　　ساتھ اس کے ہے خیالِ نارسا
یا سرورِ لذتِ دیدارِ یار　　گویا بس آدھا قدم اس کا دیار
آنکھ ہو بیدار یا ہو محوِ خواب　　دل ہے بینا، بے شعاعِ آفتاب

دل کی دنیا کی طرح ہے وہ جہاں
وہ جہاں ہے برتر از وہم و گماں

۲۷
اس جہاں میں اور بھی ہے اک جہاں　　اصل اس کی، دوسرا ہے کن فکاں
لازوال اور ہر گھڑی نوعِ دگر　　وہم سے برتر مگر آئے نظر
ہر نفس ہے اک نیا اس میں کمال　　ہر گھڑی ہے اک نیا اس میں جمال
وقت اس کا بے نیازِ ماہ و مہر　　اس کی دنیا میں سمائیں نو سپہر
دل کو ہو، جس شے کی جونہی آرزو　　غیب سے فوراً وہ آئے روبرو
کچھ بتانے سے زباں عاجز ہوئی　　یہ جہاں نور و حضور و زندگی
گل شگفتہ اس کے کہساروں میں ہیں　　چشمے جاری اس کے گلزاروں میں ہیں
ہر طرف غنچے وہاں سرخ و کبود　　قدسیوں کے دم سے ہے جن کی کشود
آبِ سیمیں اور ہوائیں عنبریں　　قصر اس کے دل نشیں، قبے حسیں
شامیانے لعل گوں، زریں طناب　　شاہدوں کی صورتیں آئینہ تاب
رومی بولا "اے گرفتارِ قیاس　　چھوڑ دے یہ اعتباراتِ حواس
نورِ حق سے کارِ خوب و کارِ زشت　　وہ بنے دوزخ، یہ بن جائے بہشت
سامنے ہیں قصر ہائے رنگ رنگ　　ہے عمل بنیاد ان کی، جائے سنگ
تم سمجھتے ہو جنہیں غلمان وحور　　وہ ہیں نورِ عالمِ جذب و سرور

زندگی اس جا فقط دیدار ہے
ذوقِ دید و لذتِ گفتار ہے

قصرِ شرف النساء[228]

میں نے پوچھا یہ مکانِ لعلِ ناب! — سامنے جس کے نگوں سر آفتاب!
یہ مقامِ پاک، یہ کاخِ بلند — حوریں جس کے در پہ ہیں احرام بند
اے کہ تو ہے سالکوں کا رہنما — اس کا مالک کون ہے مجھ کو بتا؟
بولا "یہ ہے منزلِ شرف النسا — عرشِ اعظم جس کی عظمت پہ فدا
اپنے دریا میں گہر ایسا کہاں! — ایسی بیٹی کیا جنے گی کوئی ماں!
خاکِ لاہور اس کے مرقد سے فلک — کوئی راز اس کا نہ سمجھا آج تک
وہ سراپا ذوق و شوق و درد و داغ — حاکمِ پنجاب کی چشم و چراغ
وہ فروغِ دودۂ عبدالصمد[229] — نقشِ فقر اس کا رہے گا تا ابد
عشق اس کو تھا کلام اللہ سے — پڑھتی تھی اس کو دلِ آگاہ سے
پشت پر شمشیر، قرآں ہاتھ میں — وہ فنا یکسر خدا کی ذات میں!
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — زندگانی اس کی تھی وقفِ نیاز
جس دم اس کا وقتِ آخر آ گیا — اپنی پیاری ماں سے یہ اس نے کہا
گر تو میرے راز سے ہے باخبر — ڈال اس شمشیر و قرآں پر نظر
قایم و دایم بہم دیگر ہیں یہ — کائناتِ زیست کا محور ہیں یہ
اس جہاں میں جس میں سب ہیں رفتنی — تیری بیٹی کے تھے محرم دو یہی
وقتِ رخصت ہے یہ میری التجا — تیغ و قرآں، مجھ سے مت کرنا جدا
یہ بھی سن میری وصیت غور سے — قبر بے قندیل و بے گنبد رہے

مومنوں کو تیغ اور قرآں ہے بس
میری تربت کو یہی ساماں ہے بس

ایک مدت زیرِ ماہ و آفتاب — اس کے مرقد پر رہیں تیغ و کتاب
اہلِ حق کو اس کے مرقد سے ملا — عالمِ فانی میں پیغامِ بقا
ہو گیا آخر مسلماں خود ہی مات — گردشِ تقدیر نے اُلٹی بساط
بندۂ حق غیرِ حق سے ڈر گیا — شیرِ حق نے روبہی پیشہ کیا
سوز سے محروم اس کا دل ہوا — جانتا ہے حال تو پنجاب کا
خالصہ شمشیر و قرآں لے اڑا
اس ولایت میں مسلماں مر گیا!

زیارتِ امیرِ کبیر حضرت سیّد علی ہمدانی[۲۴۰] و ملّا طاہر غنی کشمیری[۲۴۱]

حرفِ رومی نے کیا دل درد مند — آہ وہ پنجاب، ارضِ ارجمند
دوستوں کے غم سے تڑپا خلد میں — یوں پرانا غم خریدا خلد میں
اس چمن میں اک صدائے درد مند — حوضِ کوثر سے ہوئی ناگہ بلند
"چند تنکوں کو چنا خود کو جلانے کے لیے
گل یہ سمجھا ہے یہ سب کچھ آشیانے کے لیے" (غنی)
حکمِ رومی ہے کہ جو آئے نظر — مت لگا دل، دیکھ اور آگے گذر
شاعرِ رنگیں نوا، طاہر غنی — اس کا تھا باطن غنی ظاہر غنی
نغمہ خواں رہتا تھا وہ مستِ مدام — پیشِ حضرت سیّدِ والا مقام

سیّد السادات، سالارِ عجم — خالق و معمارِ تقدیرِ امم
درسِ اللہ ہو غزالی[42] نے لیا — علم حاصل اس کے آبا سے کیا
مرشدِ کشمیرِ ملکِ بے نظیر — میر و درویش و سلاطیں کا مشیر
اس زمیں کو شاہِ دریا آستیں — دے گیا تہذیب و صنعت، علم و دیں
کر گیا تخلیق، ایرانِ صغیر — حضرتِ سیّد علی میرِ کبیر

اک نظر سے کھول دے وہ سو گرہ
آ، دے اس کے تیر کو دل میں جگہ!

شاہِ ہمدان کے حضور

زندہ رود

حق نے ہمکو حکم، طاعت کا دیا — اس نے پھر شیطان کیوں پیدا کیا؟
خود بنائی ہر بدی دلکش عجب! — پھر عمل میں ہم سے کی نیکی طلب
سچ بتا، ہے یہ فسوں سازی کوئی! — کھیلے گیا ہٹ دھرم سے بازی کوئی؟
یہ سپہرِ گرد گرد اور مشتِ خاک — کام ہے یہ لائقِ یزدانِ پاک؟
کام اپنا سوچنا، سر پھوڑنا — فکرِ لاحاصل نہ لیکن چھوڑنا

شاہِ ہمدان

بندہ جو ہے خود شناس و خود نگر — نفع بخش اس نے بنایا ہر ضرر
صحبتِ شیطاں ہے انساں کو وبال — جنگِ شیطاں سے ہے انساں کا جمال

رہ ہمیشہ اہرمن سے پنجہ زن! تو سراپا تیغ، وہ سنگِ فسن!
رہ توانا، رکھ توانی، ضربِ سخت ورنہ دو عالم میں تو ہے تیرہ بخت

زندہ رود

آدمی کو کھا رہا ہے آدمی! موت اک کی، دوسرے کی زندگی!
حالِ زارِ اہلِ خطّہ دیکھ کر دل تڑپتا ہے تو جلتا ہے جگر
ایک ملّت خوش جمال و تر دماغ علم و فن کا دہر میں روشن چراغ
جام میں اس کے خود اپنا خون ہے میرے نالوں کا وہی مضمون ہے
ہو گیا جب سے وہ محرومِ خودی بن گیا اپنے وطن میں اجنبی
اس کی دولت دوسروں کے ہاتھ میں اس کی قسمت دوسروں کے ہاتھ میں
قافلے ہیں سوئے منزل سب رواں اس کی منزل کا نہیں لیکن نشاں
زندگی اس کی غلامی میں کٹی آتشِ احساس اس کی بجھ گئی
قوم ایسی وہ ہمیشہ سے نہ تھی یوں نہ وہ محکوم، دائم ہی رہی

اک زمانے میں تھی، وہ بھی تیغ زن
شیر دل، جانباز و صف در صف شکن

دیکھ اس کے کوہسارِ برف پوش اور چنار آتش بدست، آتش بدوش
ہو بہاراں، پھول برساتے ہیں رنگ خاک سے اٹھتا ہے اک طوفانِ رنگ
بادلوں کے ٹکڑے یوں اڑتے ہوئے گویا گالے روئی کے بکھرے ہوئے
کوہ و دریا اور غروبِ آفتاب میں نے دیکھا واں خدا کو بے حجاب
میں تھا اور کشمیر کا باغِ نشاط "بشنواز نے" لب پہ باصد انبساط
بولا اک طائر یہ زیرِ شاخسار ہیچ ہے نادان یہ فصلِ بہار

لالہ نکھرا، نرگسِ شہلا کھلی اور صبا اٹھکیلیاں کرتی چلی
برسوں کھلتے دیکھا سطحِ کوہ پر نسترن کو چاندنی سے خوب تر

"لاکھوں اٹھے اس سے گل کے قافلے
اک شہاب الدین[۲۳۵] نہ اٹھا خاک سے"

سوز ناک ایسی تھی طائر کی نوا جس نے میری روح کو تڑپا دیا
پھر جو اک دیوانہ یوں نالاں ہوا ہوش اڑے اور صبر بھی جاتا رہا

"کر نالہ ہائے مست کی ہم سے نہ آرزو
یہ شاخِ گل نہیں، یہ ہے افسونِ رنگ و بو
خوش ہو نہ برگِ لالہ پہ شبنم کو دیکھ کر
نادان ایک دل ہے، یہ گریاں کنارِ جو
یہ مشتِ پر کہاں، کہاں نغماتِ دلنواز
روحِ غنی ہے ماتمِ مرگِ آرزو
دینا ہمارا مجلسِ اقوام[۲۳۶] کو پیام
بادِ صبا کبھی جو جنیوا کو جائے تو

بیچے ہیں شہر و گلشن و دہقان و دشت و در بیچی ہے ایک قوم تو ارزاں بھی کسقدر[۲۳۷]

شاہ ہمدان

تجھ سے کہتا ہوں میں یہ راز اے پسر تن ہے مٹی اور جاں والا گہر
تن کو بہرِ جاں گھلانا چاہیے فرقِ پاک و خاک پانا چاہیے
ہو گیا گر تن سے اک حصہ جدا تن کا وہ حصہ ہی بس ضائع ہوا

مستِ جلوہ جاں ہو گر حاصل تجھے
گر گنوا دے پھر بھی تو پا لے اسے

اس کا جوہر بے مثال و بے نظیر
تن سے آزاد اور تن میں ہے اسیر

گر بچائے، ہے بدن اس کا کفن:
گر بکھیرے، ہے فروغِ انجمن!

کیا ہے جانِ جلوہ مست اے مردِ راد؟
اور کیا ہے جان دینے سے مراد؟

جان دینا حق سے ہے راز و نیاز
سوزِ جاں سے کوہ کو کر نا گداز

جلوہ مستی کیا ہے، عرفانِ خودی
جیسے تارا رات میں چمکے کوئی

جو ہے محرومِ خودی، نابود ہے
جس نے پایا خود کو وہ موجود ہے

جو نہ دیکھے کچھ جز اپنی ذات کے
ہے وہی آزاد قیدِ ذات سے

دیکھتا ہے جو وجودِ خویش کو
نوش سے خوشتر وہ سمجھے نیش کو

جاں ہوئی ارزاں اسے مثلِ ہوا
اس کا زنداں اس سے خود لرزاں ہوا

چیر کر شیشے سے پتھر کا جگر
ڈھونڈ کر لاتا ہے قسمت کا گہر

جاں سے جو گذرا اسی کی جان ہے
ورنہ اک دم کی یہ جاں مہمان ہے

زندہ رود

حکمتِ زشت و نکو تجھ سے سنی
اور بتا کچھ نکتہ ہائے زندگی

مرشدِ معنی نگاہاں بھی ہے تو
محرمِ اسرارِ شاہاں بھی ہے تو

مانگتا ہے حکمراں ہم سے خراج!
کیا ہے اصلِ اعتبارِ تخت و تاج؟

شاہِ ہمدان

دہر میں بنیادِ سلطانی ہے کیا؟
قتل و غارت یا ہے قوموں کی رضا!

صاف کہہ دوں تجھ سے اے والا مقام!
باج ان دو کے سوا دینا حرام

یا وہ آمر جس کی "منکم شان" ہے[۲۳۸]
جو خدا کی حجت و برہان ہے

یا وہ مردِ نوجواں، مردِ ستیز
مثلِ صرصر شہر گیر و تند خیز

جنگ میں جس کی ادا ہے قاہری
صلح میں جس کی ادا ہے دلبری

مول مل سکتا ہے گو ہندوستاں
مول ملتی ہے مگر شاہی کہاں!

جامِ جمشید، اے جوانِ باہنر
کب بنا جنسِ دکانِ شیشہ گر

گر بنا بھی وہ بجز شیشہ ہے کیا؟
شیشے کی قسمت میں ہے بس ٹوٹنا

غنی

رہنمائے ہند کون آخر بنا
کس نے اس کو ذوقِ آزادی دیا

وہ برہمن زادگانِ زندہ دل[۲۳۹]
جنکے رنگِ رخ سے لالہ بھی خجل

تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
ہے فرنگستاں میں بھی جن سے خروش

ہے ہماری خاک ان کی نادگاہ
مطلعِ کشمیر کے ہیں مہر و ماہ

اپنی خاکستر نہیں ہے بے شرر
ڈال تو خود اپنے دل پر بھی نظر

کس نے بخشا یہ تجھے سوزِ دروں
یہ دمِ بادِ بہاری یہ جنوں؟

یہ ہوا ٹے خطۂ کشمیر ہے
جس سے خاکِ تیرہ بھی اکسیر ہے

ایک دن آبِ دُلر کی موج نے
یوں کہا تھا دوسری اک موج سے

بحر میں کب تک یہ آویزش بہم
اٹھ، کہ اب ساحل سے ٹکرا جائیں ہم

وہ ہماری بیٹی وہ جوئے کہن
جس سے ہیں پرشور یہ کوہ و دمن

پتھروں سے سر کو ٹکراتی ہے وہ
کوہساروں کی بِنا ڈھاتی ہے وہ

شہر دصحرا پر ہے وہ چھائی ہوئی
سینکڑوں موجوں کی ہے پالی ہوئی

خاکیوں پہ اس کا قائم دبدبہ
یہ مقام اس کو ہمیں سے تو ملا

حدِّ ساحل میں ہے جینا اک گناہ
درحقیقت ہے یہ ساحل سنگِ راہ

ساحلوں کی قید میں جینا حرام
گو رہیں دریا میں غلطاں صبح وشام

کوہ وصحرا میں ہے جولاں زندگی
خوب ہے وہ موج جو دریا بنی

تجھ سے روشن خطِ سیمائے حیات
تجھ سے مشرق میں ہے غوغائے حیات

تیری آہِ دل سے جلتا ہے جگر
اس سے تو بے تاب، ہم بے تاب تر

تجھ سے ہے مرغِ چمن کی ہاؤ ہو
تیرے اشکوں سے کرے سبزہ وضو

تو ہے گلشن میں بہاروں کی نوید
تیری امیدوں سے جانیں پُرامید

کاروانوں کو صدا تیری درا
کیوں تو مایوس اہلِ خطہ سے ہوا؟

ان کے سینوں میں ابھی دل زندہ ہے
برف میں بھی اک شرر تابندہ ہے

جلد دیکھے گا کہ بے آوازِ صور
قوم کو دے گی جنم، خاکِ قبور

غم نہ کر اے بندۂ صاحب نظر
آہ سے اپنی جلا دے خشک وتر

شہر کتنے سقفِ نیلی کے تلے
آہِ دل سے جل کے خاکستر ہوئے

سلطنت ہے ایک نازک سا حباب
ایک ہی پھونک اس کو کر دے گی خراب

ہے نوا صورت گرِ تقدیر بھی
اس سے ہے تخریب بھی تعمیر بھی

گرچہ ہر نشتر ترا دل پر لگا
تیری ہستی کو نہ کوئی پا سکا

ہے نوائے شاعری پردہ ترا
شعر تیرا شاعری سے ماورا

خلد میں کر اک نیا طوفاں بپا
مست ہو کر تازہ اک نغمہ سنا!

زندہ رود

پی نشۂ فقیری کا، لگا نعرہ دمادم
ہو فقر میں پختہ تو تری سلطنتِ جم
میں نے کہا، دنیا سے تو بنتی نہیں میری
بولے، جو ہے یہ بات تو کر اس کو تو بہ ہم
مے خانے میں کوئی نہیں شائستۂ یاری
رستم سے بڑھا دوستی، مل مغبچہ سے کم
تنہا نہ جلا خود کو تو اے لالۂ صحرا!
اس داغِ جگر سے تو سجا سینۂ آدم
تو سوزِ دروں بھی ہے، تو ہی گرمیٔ خوں بھی
آجائے یقیں جیرے تو گر سینۂ عالم
ہے عقل چراغ، اس کو تو رکھ سامنے سب کے
مے عشق ہے پی اس کو ملے جب کوئی محرم
آنکھوں سے بہاتا ہوں میں لختِ دلِ پُرخوں
یہ لعلِ بدخشاں ہیں، سجا ان سے تو خاتم

۲۴۰

ہندی شاعر بھرتری ہری سے ملاقات

مجھ سے حوروں نے سنا میرا کلام | میرا نالہ دعوتِ سوزِ تمام
اک نے خیمے سے نکالا اپنا سر | دوسری نے کھڑکی سے جھانکا اُدھر

مجھ سے ہر دل خلد میں گرما گیا — اس زمیں کا سب کو میں نے غم دیا
ہنس کے زیرِ لب وہ پیرِ پاک زاد — بولا "اے جادوگرِ ہندی نژاد
شاعرِ ہندی پہ ڈال اپنی نظر — جس کے فیضِ چشم سے شبنم گہر
ہند کا یہ نکتہ آرا برتری — جس کی فطرت ہے سحاب آذری[۲۴۱]
غنچۂ نورس چنا اس نے سدا — کھینچ لائی یاں اسے تیری نوا
شاہ ہے اس کی نوا ہے ارجمند — فقر میں بھی ہے مقام اس کا بلند
نقشِ دلکش فکر سے اس کے عیاں — ایک حرف اس کا، معانی کا جہاں
جانتا ہے زندگی کے زیر و بم — وہ ہے جم اور شعر اس کا جامِ جم

اس کے استقبال کو دونوں اٹھے
اس سے محوِ گفتگو پھر ہم ہوئے

زندہ رود

سینکڑوں نکتے کیے تو نے بیاں — تجھ سے مشرق زندگی کا راز داں
سوز بتلا شعر کو کس نے دیا؟ — ہے خودی کی یا خدا کی ہے عطا؟

بھرتری ہری

کون جانے دہر میں شاعر ہے کیا — اس کا پردہ ہے بم و زیرِ نوا
اس کے پہلو میں دلِ پُر اضطرار — پیشِ یزداں بھی نہیں پاتا قرار
لذتِ جاں کا سبب ہے جستجو — بخشتی ہے شعر کو سوز، آرزو
اے کہ تو ہے شاعرِ شیریں کلام — گر تجھے آئے میسر یہ مقام
صرف دو شعروں سے تو اے نیک خُو — قدسیوں کے دل بھی لے سکتا ہے تُو

زندہ رود

ہند والے ہیں سراپا پیچ و تاب
اب تو کہہ دے سرِّ حق کو بے حجاب

بھرتری ہری

بے مایہ ہے، ہو سنگ کا بُت یا خدائے خشت
برتر وہی جو چھوڑ گیا مسجد و کنشت
ذوقِ عمل اگر نہ ہو، سجدوں سے فائدہ
کردار ہے یہ زندگی زیبا ہو یا کہ زشت
کہتا ہوں تجھ سے آج میں اک راز کی یہ بات
انساں ہے، لوحِ قلب پہ جس کی ہو یہ نوشت
چرخا ترا ہے، دھاگا ترا، کاتتا ہے تُو
عالم میں کب ہے حق کا اثر، مردِ خوش سرشت!
اک سنتِ جزا ہے عمل ہی کو سجدہ کر
بنتے ہیں بس عمل سے ترے، دوزخ و بہشت!

(بھرتری ہری سے ترجمہ)

ایوانِ سلاطینِ مشرق کی سیر

نادر[۲۴۲] ـــ ابدالی[۲۴۳] ـــ سلطان شہید[۲۴۴]

روح میں اتری صدائے برتری — کر گئی بے خود نوائے برتری

رومی بولا "چشمِ دل بیدار رکھ — سیرِ اپنی برتر از افکار رکھ

بزمِ درویشوں کی تو نے دیکھ لی — دیکھ اب شاہوں کا تو ایوان بھی

خسروانِ مشرق کی یہ انجمن — سطوتِ[۲۴۵] ایران و افغان و دکن

شاہِ نادر جس نے بہرِ اتحاد — قومِ مسلم کو دیا درسِ وداد[۲۴۶]

شاہِ ابدالی، شہِ حق آشنا — اس نے ڈالی قومِ افغاں کی بنا

وہ شہیدانِ محبت کا امام — آبروئے ہند و چین و روم و شام

نام اس کا مہر سے تابندہ تر — خاک اس کی مجھ سے تجھ سے زندہ تر

تھی سراپا عشق اس کی زندگی — جان اس نے کیا ہی مشتاقانہ دی

جانتے ہیں خواجۂ بدر و حنین[۲۴۷] — "فقر شہ کو وارثِ جذبِ حسینؓ"

گرچہ چھوڑی یہ سرائے ہفت روز
ہے دکن میں باقی نام اس کا ہنوز

نطق خام اور فکر میرا ناتمام — کب بتا سکتا ہوں کیا ہے وہ مقام

اس کے جلووں سے ہوئے نوری بصیر — زندہ و دانا و گویا و خبیر

قصرِ نیلم کا وہ عالی آستاں — جس کے پہلو میں ہے نیلا آسماں

اس کی رفعت فکر کی حد سے پرے — کب خیال اس کی بلندی پا سکے

وہ گُل سرو و سمن وہ شاخسار — سب لطافت سے ہیں تصویرِ بہار

ہر گھڑی، ہر برگِ گل، برگِ شجر — ہو رہا ہے رنگِ نو سے جلوہ گر
ہے فسوں گر اس قدر بادِ صبا — زرد ہے سرخ اک پلک جھپکی ذرا
ہر طرف فوّارے ہیں گوہر فروش — طائرانِ خلد ہیں گرمِ خروش!
بارگہ میں ایک ہے کاخِ بلند — جس کا ذرہ آفتاب اندر کمند
ہیں عقیقی سقف و دیوار و ستوں — فرشِ سنگِ لیشب کے اور لالہ گوں
اس بلند ایوان کے دونوں طرف — پہنے زریں پٹکے حوریں بستہ صف
بیچ میں بیٹھے طلائی تخت پر — خسروانِ جم حشم بہرام فر ۲۴۸

روی وہ آئینۂ حسنِ ادا
با کمالِ دلبری گویا ہوا!

خطۂ مشرق کا اک شاعر ہے یہ — درحقیقت شاعرِ ساحر ہے یہ
جاں ہے پرسوز اس کی، فکر اس کا بلند
اس کے شعروں سے ہے مشرق دردمند

نادر

خیر مقدم نکتہ سنجِ خاوری! — زیب دیتا ہے تجھے حرفِ دری
محرمِ اسرار ہیں، ہم کو بتا — حال کچھ تو خطۂ ایران کا

زندہ رود

بعدِ مدت آشنائے خود ہوا — دام میں غیروں کے لیکن آ گیا
ہے پرستارِ بتانِ شوخ و شنگ — خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ
ہو گیا وارفتۂ ملک و نسب — مدحِ شاپور اور تحقیرِ عرب

زیست اس کی بے نصیبِ واردات — کہنہ قبروں سے ہے جویائے حیات
ہے وطن دوست اور محرومِ خودی — عاشقِ رستم، علیؓ سے اجنبی
رہنما اس کے ہیں مغرب کے اصول
ہے اسے ہر نقشِ باطل بھی قبول!

تھا زوال ایراں کا عہدِ یزدجرد — چہرہ تھا بے نور، خوں اس کا تھا سرد
کہنہ اس کے دین و آئیں کا نظام — قصۂ پارینہ اس کے صبح و شام
مے سے بیگانہ ہوئی تھی اس کی تاک — اور محرومِ شرر تھی اس کی خاک
پھر اچانک حشرِ صحرا سے اٹھا — جس نے اس کو کی حیاتِ نو عطا
اس طرح کا حشر ہے لطفِ خدا — باقی ہے ایران، روما مٹ گیا
زندگی سے ہو گیا محروم جو — تا قیامت وہ کبھی زندہ نہ ہو
کر کے جانِ تازہ ایراں کو عطا — سوئے صحرا مردِ صحرائی گیا
ہر بنائے کہنہ کو ڈھا کر گیا — نقشِ عصرِ نو کا بٹھلا کر گیا
کچھ نہ مانا اس نے احسانِ عرب
شیوۂ مغرب پہ وہ مرتا ہے اب

ناصرِ خسرو علوی[الف] کی روح کا نمودار ہونا اور یہ غزل گا کر غائب ہو جانا!

ہاتھ کو گر، مرکبِ تیغ و قلم تو نے کیا
کر نہ غم گر مرکبِ تن لنگ ہو یا ہو عرن

الف : ایران کا مشہور شاعر : ۳۹۴-۴۸۱

ہو سرِ شمشیر و نوکِ خامہ سے پیدا ہُنر
نور جیسے نار دے، دے نار جیسے نارون
نزدِ بے دیں خنجر و خامہ ہیں محرومِ ہُنر
دیں نہیں تو کچھ نہیں شمشیر و خامہ کی ثمن
دیں، ہو دانا سے گرامی اور ناداں سے ہو خوار
پیشِ ناداں دیں ہے، جیسے پیشِ حیواں یاسمن
جیسے آدھے کپڑے سے، جامہ تنِ الیاسؑ[۴۹] کا
دوسرے آدھے سے ہو نعشِ یہودی کا کفن

ابدالی

سلطنت کی جس نے ڈالی تھی بنا — کوہساروں میں وہ جا کر بس گیا
آگ جو اس کے پہاڑوں سے اٹھی — اس کی جاں خاک اس میں یا کندن بنی؟

زندہ رود

سب اخوت میں ہیں، قومیں گرم خیز — یہ ہے بھائی بھائی سے گرمِ ستیز
اس کی ہستی سے ہے ہستی شرق کی — ہے سپہ سالار اس کا طفل بھی
اپنی ہستی سے ہے لیکن بے خبر — اپنی طاقت پہ نہیں اس کی نظر
اہلِ دل ہے اور غافل دل سے ہے — ہے جدا تن تن سے اور دل دل سے ہے
راہرو ہے، راہ سے منزل نہیں — آشنا مقصد سے اس کا دل نہیں
ہے یہ قولِ شاعرِ افغاں شناسؔ[۵۰] — اس نے جو دیکھا کہا ہے بے ہراس

۵۰ خوشحال خان خٹک

وہ حکیمِ ملّتِ افغانیاں — وہ طبیبِ علّتِ افغانیاں
انکشافِ راز بے باکانہ ہے — حرفِ حق میں شوخیِ رندانہ ہے

"اونٹ پائے گر کوئی افغانِ حُر
جس کے اوپر ہو لدا انبارِ دُر[۲۵۱]
چھوڑ کر وہ کم نظر انبارِ دُر
ہو کے خوش لے جائے گا زنگِ شتر"[۲۵۲]

ابدالی

اپنی فطرت میں ہے دل سے درد و تاب — خاک کو دل سے ہے بیداری و خواب
مرگِ دل سے جسم ہوتا ہے خراب — اور رگوں میں خون بن جاتا ہے آب
تن ہوا فاسد، بجز دل فاسد ہوا — کر نہ غفلت، رکھ نظر دل پر سدا
ایشیا ہے ایک جسمِ آب و گل — ملتِ افغاں ہے اس میں مثلِ دل
ہے فسادِ اس کا فسادِ ایشیا — ہے کشاد اس کی کشادِ ایشیا
دل ہو گر آزاد، تن آزاد ہے — دل نہ ہو آزاد، تن برباد ہے
مثلِ تن وابستہ دل آئیں سے ہے — دل ہے کیں سے مردہ، زندہ دیں سے ہے

دین کی قوت ہے وحدت میں نہاں
بنتی ہے ملّت جو وحدت ہو عیاں

شرق کو مرگِ خودی تقلیدِ غرب — چاہیے اس کو فقط تنقیدِ غرب!
قوتِ مغرب نہیں چنگ و رباب — اور نہ رقصِ دخترانِ بے حجاب!
ساقیِ عریاں اور نہ قطعِ زلف و مُو — اور نہ سحرِ ساحرانِ لالہ رُو
محکمی مغرب کی لادینی نہیں — شان اس کی خط لاطینی نہیں

غربؐ قوتِ علم سے حاصل کرے — روشن اس کا ہے چراغ اس آگ سے
علم و فن میں وضع و قطعِ جامہ کب! — سدِّ راہِ علم ہے، عمّامہ کب!
بہرِ دانش اے جوانِ شوخ و شنگ — مغز حاصل کر، نہ ملبوسِ فرنگ
ہے فقط مطلوب اس رہ میں نگاہ — تاجِ زرّیں اور نہ پشمینی کلاہ

گر حصولِ علم و فن ہو مدّعا
فکرِ عالی چاہیے، طبعِ رسا

جس نے کھایا راتوں کو دودِ چراغ — اس نے پایا علم و حکمت کا سراغ
راستہ ہے ملکِ معنی کا کھلا — پر کسے بے جہدِ پیہم مل سکا
تُرک کھا کر زہرِ نوشینِ فرنگ — ہو گیا شیدائے آئینِ فرنگ
گم جو تریاقِ عراق اس نے کیا — سمجھو بس اس کا ہے اب حافظ خدا
بندۂ افرنگ کا ذوقِ نمود — غرب سے لیتا ہے بس رقص و سرود
عیشِ جاں لیتا ہے دے کر نقدِ جاں — علم سے مرغوب اسے عیشِ جہاں
ہے تن آسانی سے فطرت اس کی خام — اس کو بس مطلوب ہے ہر سہل کام

جز ہلاکت سہل انگاری نہیں
ایسی مہلک کوئی بیماری نہیں

زندہ رود

جانتے ہیں آپ تہذیبِ فرنگ — اس کی دنیا میں ہیں سو فردوس رنگ
اس کے جلووں نے جلائے خانماں — پھونک ڈالے گلستان و آشیاں
اس کا ظاہر پرکشش، روشن تمام — ناتواں دل ہے، نظر کا ہے غلام
آنکھ دیکھے، دل کو ہوتا ہے جنوں — گرتا ہے آگے بتوں کے سرنگوں

کون جانے شرق کی قسمت ہے کیا؟ — اس نے ظاہر پہ کیا دل کو فدا
شرق کی بدبختیوں کا کیا شمار — وہ ہوا ظاہر پرستی کا شکار

ابدالی

جس سے بن سکتی ہے قسمت شرق کی — وہ ہے عزمِ پہلوی و نادری!
پہلوی، وہ وارثِ تختِ قباد — فکر سے اس کے ہے ایراں کی کشاد
شاہِ نادر، عظمتِ درّانیاں — وہ نظامِ ملتِ افغانیاں
اس کا دل دین و وطن کے غم میں زار — کوہ سے اترا وہ بہرِ کارزار
وہ سپاہی، وہ سپہ گر، وہ امیر — غیر کو فولاد، اپنوں کو حریر
جس نے پائی دولتِ خود آگہی — عصرِ نو کو خوب سمجھا ہے وہی

اہلِ مغرب کا ہے شیوہ ساحری
غیر پر ہے تکیہ کرنا کافری

سلطانِ شہیدؒ

کچھ سنا ہندوستاں کی داستاں — جس کا تنکا بھی ہے رشکِ بوستاں
مسجدوں میں اس کی ہنگامہ نہیں — روشن اس کے دیر میں شعلہ نہیں
جس کے غم میں میں نے دل کو خوں کیا — دل میں جس کی یاد کو تازہ رکھا
میرے غم سے اس کے غم کو کر قیاس — آہ وہ معشوقِ عاشق ناشناس

زندہ رود

ہند نے مانا نہ قانونِ فرنگ — وہ نہیں ہے صیدِ افسونِ فرنگ
روح پر بارِ گراں، آئینِ غیر — گو ہو وحیِ آسماں، آئینِ غیر

سلطانِ شہیدؒ

مُشتِ گِل سے آدمی پیدا ہو جب — دل میں لے کر آرزو و تاب و تب
لذتِ عصیاں کو چکھنا اس کا کام — اور نظر خود پر ہی رکھنا اس کا کام
چونکہ بے عصیاں نہیں ملتی خودی — بے خودی ملتی نہیں ہے زندگی
تو نے دیکھے ہیں مرے شہر و دیار — تھا زیارت گہ تری میرا مزار
اے شناسائے حدودِ کائنات! — کیا دکن میں دیکھے آثارِ حیات؟

زندہ رود

۲۵۵ھ

پُر نم اشکوں سے مری خاکِ دکن — بن گیا ہے لالہ زار اس کا چمن
۲۵۶ھ
رود کاویری کا جاری ہے سفر — اس میں آیا اک نیا طوفاں نظر

سلطان شہیدؒ

اے کہ حاصل تجھ کو حرفِ دل فروز — تیرے اشکوں سے ہے میرے دل میں سوز
چھیڑ دے گر ناخنِ مردانِ راز! — خون کی نہریں بنیں رگہائے ساز
ایسی درد انگیز ہے تیری نوا — سوز ہر سینے کو کرتی ہے عطا
میں تھا پیشِ حضرتِ مولائے کلؐ — جو ہیں ہادیؐ سب کے، سردارِ رسلؐ
گو وہاں گفتار کی جرأت نہیں — روح کو دیدار سے فرصت نہیں
میں ہوں دلدادہ ترے اشعار کا — شعر تیرا میرے لب پہ آ گیا
آپؐ نے فرمایا "یہ کس کا ہے شعر؟ — زندگی کا ولولہ رکھتا ہے شعر"
اے کہ رکھے سوزِ جاں تیرا کلام — رودِ کاویری کو دے میرا پیام

تو بھی زندہ رُود، وہ بھی زندہ رُود
خوب ہو گر ہو سرود اندر سرود

سلطانِ شہید کا رودِ کاویری کو پیغام

حیات و موت اور شہادت کی حقیقت!

رودِ کاویری ذرا آہستہ چل ۔ اے سفر سے خستہ پا! آہستہ چل
کوہساروں نے فغاں تیری سنی ۔ تو نے اپنی راہ پلکوں سے چنی
تو ہے مجھ کو رشکِ جیحون و فرات ۔ ہے دکن کو تیرا آب، آبِ حیات
تیرے ساحل پر تھا شہرِ پر نگار[1] ۔ جلوہ ہائے حسن کی تیرے بہار
تازہ ہے پیری میں بھی ترا شباب ۔ ہے وہی جوش و خروش و پیچ و تاب
تیری موجوں نے گہر پیدا کیے ۔ حسن تیرا تا ابد قائم رہے
اے کہ تیرے ساز میں سوزِ دوام ۔ بے خبر تجھ کو یہ ہے کس کا پیام؟
جس کی سطوت پر تو ہوتا تھا نثار ۔ جس کی دولت کا تھا تو آئینہ دار
جس کی ہمت سے بنے صحرا، بہشت ۔ جس نے اپنے خوں سے لکھی سرنوشت
خاک جس کی مرجعِ صد آرزو ۔ تجھ کو مضطر کر گیا جس کا لہو
قول جس کا سر بسر کردار تھا
شرق محوِ خواب، وہ بیدار تھا
میں بھی تو بھی موجۂ رودِ حیات ۔ ہے تغیر آشنا یہ کائنات

---

[1] شہر سرنگاپٹم

ہے نیا ہر دم جہانِ رنگ و بُو — اک نئے عالم کی اس کو جستجو
زندگی کا تانا بانا رفت و بود — اس پہ ہی قائم ہے یہ ذوقِ نمود
مثلِ راہرو راہ بھی گرمِ سفر — ہر جگہ پنہاں سفر، پیدا حضر
کاروان و ناقہ و دشت و نخیل — ہیں یہاں سب شاکیٔ دردِ رحیل
گل چمن میں میہمانِ یک نفس — رنگ و بو ہے امتحانِ یک نفس
گلستاں ہے شادماں اور سوگوار — نعشِ گل بر دوش، غنچہ در کنار
میں نے لالے سے کہا سوزاں ہو اور! — یہ کہا اس نے "کر اے نادان غور!"

ہیں خس و خاشاک بنیادِ وجود
غیر حسرت کیا ہے پاداشِ نمود؟

دیکھ سوئے عالمِ فانی نہ آ — تو عدم سے جانبِ ہستی نہ آ
آ گیا گر تو، نہ جی مثلِ شرر — بہرِ خرمن رہ سدا گرمِ سفر
تاب و تب رکھتا ہے گر مانندِ مہر — کر مُسَخَّر وسعتِ آبادِ سپہر
کوہ و مرغ و گلشن و صحرا جلا! — مچھلیوں کو تو تہِ دریا جلا!
سہ سکے گر دل پہ تیرِ حادثات — مثلِ شاہیں ہو تری موت و حیات
چونکہ عرضِ زندگی میں ہے ثبات[259] — میں نے بس چاہا نہیں طولِ حیات

بھیڑ کے سو سال جینے سے بھلی
شیر کی صرف ایک دن کی زندگی!

زیست کی بنیاد تسلیم و رضا[260] — موت، نیرنگ و طلسم و سیمیا[262]
مردِ حق ہے شیر، موت اس کا شکار[261] — موت جیسے ہیں مقام اس کے ہزار
موت سے اس طور مردِ حق ملے — جس طرح شاہیں کبوتر پر گرے
موت سے ہر لحظہ مرتا ہے غلام — زندگی ہے خوف سے اس پر حرام

مردِ حُر کی شان ہے کچھ اور ہی — دیتی ہے موت اس کو تازہ زندگی
موت سے بے خوف اس کی جان ہے — موت بھی اس کو فقط اک آن ہے
مرگ اتارے تن کو جو زیرِ لحد — بچ تو اس سے وہ ہے مرگِ دام و دد
مانگ یزداں سے وہ مرگِ ارجمند — تن کو جو کرتی ہے مٹی سے بلند
ہے یہی مرگ انتہائے راہِ شوق — آخری نعرہ سرِ جنگاہِ شوق
گرچہ مومن کو شکر ہر مرگ ہے — مرگِ ابنِ مرتضیٰؓ ہے اور شے
جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری — جنگِ مومن، سنّتِ پیغمبری
جنگِ مومن کیا ہے؟ ہجرت سوئے دوست — ترکِ عالم، اختیار کوئے دوست
ہے یہ فرمانِ نبی رکھ اس کو یاد — دینِ مسلم میں ہے رہبانی جہاد

اک شہید اس نکتے سے ہے باخبر
اس نے یہ نکتہ خریدا دے کے سر

زندہ رود فردوسِ بریں سے رخصت ہوتا ہے
اور حُورانِ بہشتی غزل کا تقاضا کرتی ہیں

چھُٹ رہا تھا مجھ سے دامن صبر کا
چل یہاں سے پیرِ رومیؒ نے کہا
وہ حدیثِ شوق، وہ جذبِ یقیں
ہائے وہ ایوان، وہ کاخِ بریں!

بادلِ پُردرد جنّت سے چلا
در پہ جنّت کے ہجومِ یار تھا
ان کے لب پہ زندہ رود! اے زندہ رود!

زندہ رود اے صاحبِ سوز و سرود!
ہر طرف سے سب کی فرمائش یہی
بیٹھیے دم بھر ہمارے پاس بھی

زندہ رود

جس کو ہیں معلوم اسرارِ سفر — بڑھ کے رہزن سے اسے منزل کا ڈر
عشق کو ہیں ایک یہ ہجر و وصال — عشق کی منزل جمالِ لایزال ۲۶۲
سامنے گرنا بتوں کے ابتدا — دلبروں کو چھوڑنا ہے انتہا
عشقِ بے پروا ہے مصروفِ سفر — ہے مکان و لامکاں میں راہ سپر

اپنا مسلک مثلِ موجِ تیز گام
اختیارِ جادہ و ترکِ مقام

حُورانِ بہشتی

اے کہ تُو ہے شاعرِ شیریں ادا
اک نوائے تازہ کر ہمکو عطا!

زندہ رود

ابھی آدمی تُو نہ پا سکا، پہ تجھے خدا کی تلاش ہے
ابھی خود سے بھی نہیں آشنا، تجھے آشنا کی تلاش ہے

ذرا شاخِ گل سے لپٹ ابھی، ذرا کھینچ اس سے ابھی نمی
کہ پریدہ رنگ ہے تو ابھی، تجھے کیوں صبا کی تلاش ہے؟
وہ تو قطرہ ہے دل کے خون کا جسے دیتے ہیں نام مشک کا
تجھے دل غزالِ حرم ملا تجھے کیوں خطا کی تلاش ہے؟
ہے عیارِ فقرِ شہنشہی، نہ گداگری ہے نہ مفلسی
ہے مقام تیرا سریرِ جم، تجھے بوریا کی تلاش ہے!
مرے لب پہ کب وہ ملے نوا، دلِ لالہ جس سے لہو ہوا
ہے مقام اس کا تو دل مرا، تجھے جس نوا کی تلاش ہے
ملے اہلِ طب سے تو تو تیا، وہ علاجِ کم بصری کہاں؟
وہ دوا تو رکھتے ہیں اہلِ دل، تجھے جس دوا کی تلاش ہے
کفِ خاک جس سے ہو کیمیا، وہ نظر کا اپنی ہے معجزہ
وہ ہمارے آئے حضور میں، جسے کیمیا کی تلاش ہے!

حضور

گرچہ اس کے جلوے جنت کی بہار — جاں ہے لیکن طالبِ دیدارِ یار
ہم کہ اپنی اصل سے درپردہ ہیں — طائرانِ آشیاں گم کردہ ہیں
علم ہے گر بد نہاد و بد گہر — ہے حجابِ اکبر اک پیشِ نظر[۲۶۴]
ہاں اگر ہو علم کا مقصد نظر — راہ بھی ہے اور ہے وہ راہبر
سامنے رکھتا ہے وہ نقشِ وجود[۲۶۵] — تاکہ اس سے پوچھے تو رازِ نمود
راہ کو ہموار کرتا ہے یونہی — شوق کو بیدار کرتا ہے یونہی
درد و داغ و تاب و تب بخشے تجھے — گریہ ہائے نیم شب بخشے تجھے

علم ہے شرحِ جہانِ رنگ و بو — آنکھ میں نور اس سے دل میں آرزو
تجھکو لاتا ہے مقامِ شوق پر — پھر چلا جاتا ہے تنہا چھوڑ کر
عشق کی خلوت ہو خالی غیر سے — آئے اپنی آنکھ سے غیرت اسے

ابتدا میں راہ بھی ہمراہ بھی
ساتھ آخر میں نہیں ہوتا کوئی

۲۶۶

چھوڑ کر نکلا میں سب حور و قصور — تھا سفینہ جان کا اور بحرِ نور
ہو گیا محوِ تماشائے جمال — جو ہے ہر دم نو بہ نو اور لایزال
میں ہوا غرقِ ضمیرِ کائنات — اور نظر مثلِ رباب آئی حیات
اس کا تھا ہر تار اک تازہ رباب — ہر نوا جس کی سراپا اضطراب
ہم ہیں سب اک خاندانِ نار و نور — آدم و مہر و مہ و جبریل و حور
پیشِ جاں آئینہ آویزاں کیا — ساتھ حیرت کے یقیں بھی مل گیا
آج کی یہ صبح پیدا جس کا نور — دوش و فردا جمع ہیں اس کے حضور
حق نے ظاہر کر دیے اسرارِ خویش — میری نظروں سے کیا دیدارِ خویش
غیرِ کاہش، جانفزا ہے اس کی دید — قبرِ تن کو چھوڑنا ہے اس کی دید
عبد و مولا عاشقانِ یک دگر — دونوں کا بے تاب ہے ذوقِ نظر

زندگی، ہر جا سراپا جستجو
کون جانے صید میں ہوں یا کہ تو

لذتِ دیدار دی ہے عشق نے — جرأتِ گفتار دی ہے عشق نے
اے کہ تو ہے دو جہاں سے باخبر — اک ذرا اس خاکداں پر بھی نظر
بندۂ حر کو نہیں ہے سازگار — اس کے سنبل بھی اگائیں نیشِ خار
حاکموں کا مشغلہ عیش و طرب — کارِ محکوماں شمارِ روز و شب

تیری دنیا بادشاہی سے خراب! آستیں میں شب کو رکھے آفتاب!
دانشِ افرنگ ہے غارت گری لے اڑی مسلم سے زورِ حیدری ۱۹۷
ہے مسلماں آج مجبور و غریب فکر کو اس کے نہیں مرکز نصیب۔
گھات میں اس سخت جاں کے ہیں چار والی و ملّا و میرہ و سود خوار
یہ جہاں ہے کب ترے شایانِ شاں
داغ ہے دامن پہ تیرے یہ جہاں

نداے جمال

کلکِ حق نے لکھا نقشِ اچھا برا ہمکو جیسا سازگار آیا لکھا
رازِ ہستی کیا ہے؟ مردِ خود نگر حسنِ ذاتِ حق سے ہونا بہرہ ور
آفرینش: دلربا کی جستجو خود نمائی کی سراسر آرزو
سارے یہ ہنگامہ ہائے ہست و بود ہے ہمارے حسن سے ان کا وجود
زندگی فانی بھی ہے، باقی بھی ہے ذوقِ خلاقی بھی، مشتاقی بھی ہے
زندہ ہے مشتاق بن خلاق بن! مالکِ کُل، صاحبِ آفاق بن!
توڑ دے اس کو، نہ ہو جو سازگار کر جہانِ نو کو دل سے آشکار
ہے گراں یہ بندۂ آزاد پر زیست غیروں کے جہاں میں ہو بسر
جو کوئی بے قوتِ تخلیق ہے وہ ہمارے سامنے زندیق ہے ۱۹۸
جلوۂ حق سے نہیں وہ بہرہ ور اس کا نخلِ زندگی ہے بے ثمر
اٹھ تو بُرّاں صورتِ شمشیر بن!
خود تو اپنے عصر کی تقدیر بن!

زندہ رود

کیا ہے آئینِ جہانِ ہست و بود — لوٹ کر آتا نہیں پھر آبِ رود
زندگی خوگر نہیں تکرار کی — زندگی کی شان ہے ہر دم نئی
گردشِ دوراں کو رجعت کب ہوئی؟ — گر پڑی جو قوم وہ پھر کب اٹھی؟
قوم کوئی مر کے زندہ کب ہوئی؟
اس کا بس چارہ ہیں صبر و قبر ہی

ندائے جمال

زندگانی کب ہے تکرارِ نفس — حی و قیوم اس کی ہے بنیاد بس
قرب اس کا جس کا قول "انّی قریب"[۲۶۹] — ہے حیاتِ جاودانی سے نصیب
فرد کو توحید لاہوتی[۲۷۰] کرے — قوم کو توحید جبروتی[۲۷۱] کرے
رومیؒ و عطارؒ و بوذرؓ[۲۷۲] اس سے ہیں — طغرل[۲۷۳] و سلجوق[۲۷۴] و سنجر[۲۷۵] اس سے ہیں
بے تجلی کب ہے آدم کو ثبات — ہے تجلی فرد و ملت کی حیات
دونوں کو توحید سے حاصل کمال — زندگی اس کو جلال اس کو جمال!
یہ سلیمانی[۲۷۶] ہے سلمانی[۲۷۷] ہے وہ — یہ سراپا فقر[۲۷۸] سلطانی[۲۷۹] ہے وہ
وہ ہے یک بیں، یہ بنا خود ایک ہی
بیٹھ اس کے پاس اس کے ساتھ جی!

کیا ہے ملت سن اے مردِ لاالٰہ! — لاکھ آنکھیں اور سب کی اک نگاہ
حجت و دعویٰ ہیں سارے دل ہیں ایک — گو جدا خیمے ہمارے، دل ہیں ایک
یک نگاہی سے ہیں ذرّے آفتاب — یک نگہ بن تا کہ حق ہو بے حجاب!

ہے وجودِ روحِ ملّت، انجمن　　روحِ ملّت کب ہے محتاجِ بدن؟
کر لے حاصل یک نگاہی، زندہ ہو　　ترک کر بے مرکزی، پایندہ ہو
مست جب توحید سے ملّت ہوئی
اس کو حاصل قوت و عظمت ہوئی

انجمن سے شانِ ملّت برقرار　　اور شکست اس کی ہے ملّت کا مزار
یک نگاہی جلوہ ہے توحید کا　　تو حقارت سے نہ اس کو دیکھنا
وحدتِ فکر و عمل کر اختیار!
تا کہ تو عالم میں ہو با اقتدار

زندہ رود

کون میں ہوں؟ کون تو؟ عالم کہاں؟
کیوں یہ دوری ہے ہمارے درمیاں؟
کیوں میں صیدِ پنجۂ تقدیر ہوں؟
تو ہے باقی اور فانی میں ہوں کیوں؟

ندائے جمال

ہے جہانِ چار سو میں تو مکیں　　جو سمائے اس میں مرتا ہے وہیں
خود کو پا تو زندگی چاہے اگر　　چار سو کو اپنے اندر غرق کر!
پھر تو جانے میں ہوں کیا اور تو ہے کیا؟
اور تو کیسے جیا، کیسے مرا؟

زندہ رود

تجھ سے اس نادان کی ہے التجا　　چہرۂ تقدیر سے پردہ اٹھا

۱۸۲ے
روس و الماں کا بھی دیکھا انقلاب　　جانِ مسلم میں بھی دیکھا اضطراب
دیکھ لی تدبیر شرق و غرب کی　　اب دکھا تقدیر شرق و غرب کی

تجلئ جلال کا گرنا

ناگہاں آیا نظر اپنا جہاں　　وہ زمیں اپنی وہ اپنا آسماں
غرق تھا نورِ شفق میں وہ جہاں　　سرخ تھے اس کے زمین و آسماں
اس تجلی سے میں مست ایسا ہوا　　ہو کے بے خود مثلِ موسیٰ گر پڑا
ہو گیا ظاہر ہر اک رازِ خفی　　تابِ گویائی مگر جاتی رہی!

تڑپا قلب عالم بے آب و خاک!
اس سے آئی اک نوائے سوز ناک!

شرق کو چھوڑ تو وارفتۂ افرنگ نہ ہو
ایک کوڑی کے برابر نہیں یہ کہنہ و نو
وہ نگیں ہار دیا اہرمنوں کو تو نے
جس کو جبریل کے بھی پاس نہیں رکھتے گرو
زیست ہے انجمن آرا و نگہدارِ خودی!
ساتھ چل سب کے تو رہ سب سے الگ اے رہرو!
رشکِ صد جلوۂ خورشید ہے جلوہ تیرا
اس طرح جی کہ ترا ہر ذرّے میں پہنچے پرتو
جس طرح ایک پرِ کاہ ہوا کے آگے
یوں گئے قیصر و دارا و قباد و خسرو

تنگ ظرفی سے تری، میکدہ بدنام ہوا
جام لے، ہوش سے پی اور چلا جا رہرو!

جاوید سے خطاب

نئی نسل کو پیغام

یہ سخن آرائی ہے بے فائدہ — دل میں جو تھا وہ نہ لب پر آسکا
گرچہ سو نکتے کیے میں نے بیاں — ایک نکتہ ہے مگر اب تک نہاں
گر کہوں ہو جائے وہ پیچیدہ تر — حرف و صوت اس کو کریں پوشیدہ تر
اس کو تو میری نظر ہیں پا سکے
یا مری آہِ سحر ہیں پا سکے

درسِ اوّل ماں ہی نے تجھ کو دیا — تیرا غنچہ اس کے دم ہنسا سے کھلا
اس کے دم نے تجھ کو بخشے رنگ و بو — بے بہا اس سے ہے میرے لعل تو
لا الٰہ تجھ کو سکھایا اس نے ہی — دولتِ جاوید بھی اس سے ملی
اے پسر ذوقِ نگہ تو مجھ سے لے — اور سوزِ لا الٰہ تو مجھ سے لے
لا الٰہ کہہ سوزِ جاں سے اے جواں — تاکہ تیرے تن سے آئے بوئے جاں
لا الٰہ سے جلوہ افگن مہر و ماہ — رکھتا ہے یہ سوز، قلبِ کوہ و کاہ
کب یہ حرفِ لا الٰہ گفتار ہے — لا الٰہ اک تیغِ بے زنہار ہے
سہنا ضربِ لا الٰہ دشوار ہے
جو جیے اس آگ میں قہار ہے

مومن اور رکھنا غلامی کا مذاق — مومن اور خواری و فقر و نفاق

س نے بیچا ملک بھی ایمان بھی　　گھر جلایا گھر کا سب سامان بھی
بے جلالِ لا الٰہ اس کی نماز　　بے جمالِ ناز ہے اس کا نیاز
کیش اس کی نمازیں بے سرور　　اس کی دنیا ہو گئی محرومِ نور
حافظ اللہ جس کا ساز و برگ　　اب اسے ہے حبِّ مال و خوفِ مرگ
ب کہاں وہ جوش وہ مستی وہ شور　　دیں کتابوں میں ہے مومن زیبِ گور
عصرِ حاضر کا اثر اس پہ ہوا　　دیں قبول اس نے دو نبیوں کا کیا [۲۹۲]
یک ایرانی ہے اک ہندی نژاد　　منکرِ حج وہ، یہ بیزارِ جہاد
ب جہاد و حج نہ ٹھہرے واجبات　　ہو گیا بے جاں، تنِ صوم و صلوٰۃ
وں گر بے جاں نمازیں اور صیام　　فرد ہو گمراہ، ملت بے نظام
سوزِ قرآں سے ہیں ان کے دل تہی　　کیا بھلا ایسوں سے امید بھی

اب مسلماں میں نہیں باقی خودی
آ بچا خضر! اس کی کشتی ڈوبتی

سجدہ وہ ہے جس سے لرزاں ہو زمیں　　جس کے آگے خم ہو گردوں کی جبیں
سنگ اگر کر لے قبول اس کا نشاں　　آسماں پہ وہ اڑے بن کر دھواں
سجدہ صرف اب سر جھکانے کا ہے نام　　اور اس میں ضعفِ پیری ہے تمام
وہ شکوہِ ربّیَ الاعلیٰ گیا　　سوچ آخر یہ گنہ کس نے کیا
ہر کوئی ہے سوئے منزل تیز گام　　ناقہ اپنی ہرزہ رو اور بے لگام

صاحبِ قرآں ہو، بے ذوقِ طلب
العجب، ثم العجب، ثم العجب

گر ہ کر ے تجھے صاحب نظر　　تو نظر ڈال آنے والے دور پر
عش ے باک و زل میں بے گداز　　شرم سے عاری نظر غرقِ مجاز

علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل   کر رہے ہیں سب طوافِ آب و گل
زاد گاہِ مہر یعنی ایشیا   غیر بیں ہے، خود سے ہے ناآشنا
اس کا دل بے وارداتِ نو بہ نو   اس کے حاصل کی ہے قیمت ایک جو
عالمِ کہنہ میں اس کا روزگار   ساکن و یخ بستہ و بدحال و خوار
صیدِ ملّا اور نخچیرِ ملوک   ہے غزالِ فکر اس کا لنگ و لوک
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ   ہیں سبھی نخچیرِ صیادِ فرنگ
رونما اس کے عالمِ افکار کو   آشکار اس نے کیا اسرار کو

اپنے سینے میں لہو دل کو کیا
اس کے دل میں تب کیا طوفاں بپا

رازِ عصرِ نو مرے دو حرف میں   دو سمندر بند ہیں دو ظرف میں
حرفِ پیچا پیچ، حرفِ نیش دار   تاکہ ہو عقل و دلِ مرداں نشکار
حرفِ ذو معنی، باندازِ فرنگ   نالہ ہائے مست سے پُر تارِ چنگ
اصل[الف] اس کی ذکر، اُس کی اصل فکر[ب]   کاش تو ہوتا یہ دارِ فکر و ذکر
آب جو ہوں، دو سمندر میری اصل   فصل میری فصل ہے جو خود ہے وصل

بدلی عصرِ تازہ نے اپنی ادا
اک نیا محشر کیا دل نے بپا

نوجواں ہیں تشنہ لب، خالی ایاغ   شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و ناامید و بے یقیں   دیدۂ بینا انہیں حاصل نہیں
ہیں وہ محرومِ خودی در محو غیر   ان کی مٹی سے ہوئی تعمیرِ دیر

الف شعری تصانیف
ب تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کی طرف تلمیح ہے۔

اپنے مقصد سے ہے کتب بے خبر — جذبۂ دل پہ نہیں اس کی نظر
نورِ فطرت کو دلوں سے دھو دیا — اک گلِ رعنا نہ گلشن میں کھلا
خشت، یہ معمارِ ملت کج رکھے — خوئے بلبل، بچۂ شاہیں کو دے
علم سبب رکھتا ہے سوزِ حیات — دل کو کب حاصل ہو لطفِ واردات
علم ہے شرحِ مقاماتِ خودی — علم ہے تفسیرِ آیاتِ خودی
پہلے نارِ حس میں جلنا چاہیے — پھر کھرا کھوٹا تو اپنا پا سکے

علمِ حق، اوّل حواس، آخر حضور
انتہا اس کی کہاں اے بے شعور

تو پڑھے سو دفترِ علم و ہنر — لاکھ بہتر اس سے، اک درسِ نظر
ہر کوئی اس مے سے، جو بخشے نظر — مست ہوتا ہے بہ اندازِ دگر
ہوتے ہیں بادِ سحر سے گل چراغ — کھلتے ہیں اس سے ہی لالے کے ایاغ
کم خور و کم خواب و کم گفتار بن! — اپنا محور صورتِ پرکار بن!
گو ہے کافر منکرِ ذاتِ خدا — منکرِ خود اس سے بھی کافر بڑا
ذات کے انکار سے ہے وہ عجول — یہ ہے عاجل اور ظالم اور جہول!
شیوۂ اخلاص کو کر اختیار — اور مٹا دے دل سے خوفِ شہریار
رہ تو عادل قہر ہو یا ہو رضا — کر تو حاصل دولتِ فقر و غنا
حکم ہو مشکل تو مت تاویل ڈھونڈ — صرف اپنے قلب کی قندیل ڈھونڈ
حفظِ جاں سے ذکر و فکرِ بے حساب — حفظِ تن ہے ضبطِ نفس، اندر شباب
حکمرانی زمین و آسماں — بخشتا ہے تجھ کو حفظِ جسم و جاں
سیر کی لذت ہے مقصودِ سفر — اڑ نہ تو گر آشیاں پر ہے نظر
ماہ بھی گردش سے ہے صاحب مقام — ہے سفر میں رکنا آدم کو حرام

زیست کا پرواز ہی پر ہے مدار — کب اسے ہے آشیانہ سازگار

رزقِ زاغ و مور از زیرِ خاکِ گور
رزقِ شاہیں ہے فرازِ ماہ و ہور[1]

سرِّ دیں سچ بولنا، کھانا حلال — خلوت و جلوت میں دیدارِ جمال
کر تو سختی سے اطاعت دین کی — دل لگا اللہ سے بے خوف جی
تاکہ ہوں اسرارِ دیں تجھ پہ عیاں — کرتا ہوں قصہ مظفر[2] کا بیاں
خوبیِ کردار میں فردِ فرید — بادشاہ اور فقر میں تھا بایزید
ایک بے مثل اسپ اسکے پاس تھا — جس کو تھا مانندِ فرزنداں رکھا
نسل اس گھوڑے کی تھی نسلِ عرب — باوفا، بے عیب، پاکیزہ نسب
مردِ مومن کو عزیز اے نکتہ رس — ہیں فقط قرآن و شمشیر و فرس
وصف میں بے مثل وہ خیرالجیاد[3] — کوہ و دریا پر تھا چلتا مثلِ باد
جنگ کے دن تھا نظر سے تیزتر — اک بگولہ برسرِ کوہ و کمر
اور رفتار اس کی تھی محشر اثر — اس کے سم سے شق پہاڑوں کے جگر
ایک دن بیمار وہ گھوڑا ہوا — ہو گیا دردِ شکم سے ادھ موا
دیکھا جب بیطار نے حالِ خراب — جاں بچائی اسپ کی دیکر شراب
پھر سوار اس پر نہ وہ سلطاں ہوا — دیکھ تو اس کا کمالِ اتقا

حق کرے تجھ کو عطا قلب و جگر
طاعتِ مردِ خدا پہ غور کر!

[1] خورشید
[2] سلاطینِ گجرات میں سے ایک بادشاہ جو سلطان محمود بیگڑھ کا بیٹا تھا
[3] خیرالجیاد: اصیل اور نجیب گھوڑا

دیں ہے جلنا سر بسر بہرِ طلب
انتہا اس کی ہے عشق، آغاز ادب

آبرو گل کی ہے اس کا رنگ و بو
بے ادب، بے رنگ و بو، بے آبرو

دیکھتا ہوں جب جوانِ بے ادب
میرا دن ہوتا ہے تیرہ مثلِ شب

دل تڑپنے لگتا ہے بے حد مرا
مجھ کو یاد آتا ہے عہدِ مصطفیٰؐ

ہوں بہت دل تنگ اپنے عہد سے
یادِ ماضی سے مجھے راحت ملے

ستر زن ہے زوج یا خاکِ لحد
اور ستر مرد، ترکِ یارِ بد

حرفِ بد کو لب پہ لانا ہے بُرا
کافر و مومن ہیں سب مردِ خدا

آدمیت، احترامِ آدمی
غور کر کیا ہے مقامِ آدمی!

آدمی سارے ہیں باہم ایک تن
دوستی کی راہ پر ہو گامزن

مردِ حق ہے، مثلِ حق سب کا رفیق
کافر و مومن پہ یکساں ہے شفیقؐ

وسعتِ دل میں سما لے کفر و دیں
دل ہو گر دل سے گریزاں، دل نہیں

دل اگرچہ ہے اسیرِ آب و گل
پر تمام آفاق ہے، آفاقِ دل

خواہ دولت مند تو کتنا بنے
فقر کی دولت نہ دینا ہاتھ سے

سوز اس کا ہے زباں بیاں میں تری
یہ وراثت ہے ترے اجداد کی

حرفِ نقد و وردِ دل دوراں سے مانگ
مانگ سب حق سے نہ کچھ سلطاں سے مانگ

ہیں بہت مردِ حق اندیش و بصیر
کثرتِ دولت سے بے نورِ ضمیر

کثرتِ دولت مٹاتا ہے گداز
دل سے جاتا ہے نیاز، آتا ہے ناز

سالہا گھومتا ہوں میں گردِ جہاں
نم سے خالی دیکھی چشمِ مغنماں!

خوب ہے وہ جو فقیرانہ جیا
حیف وہ جو حق سے بیگانہ جیا

ؐ: حدیث پاک: ارحم من فی الارض یرحمک من فی السماء

ڈھونڈ مسلم میں نہ تو وہ درد و ذوق   وہ یقیں، وہ رنگ و بو، وہ سوز و شوق
علمِ قرآں سے ہیں عالم بے نیاز   بھیڑیے ہیں صوفیاں سود و ساز
خانقاہوں میں ہے گرچہ ہاؤ ہو   بادۂ حق سے ہے پُر کس کا سبو
اور مسلمانانِ افرنگی مآب   سمجھیں وہ کوثر اسے جو ہے شراب
ہیں یہ سب نا آشنائے سرِّ دیں   بلکہ یہ سب اہلِ کیں ہیں اہل دیں
خیر و خوبی اہلِ دولت پر حرام   رکھتے ہیں صدق و صفا مفلس عوام
جان فرقِ اہلِ دیں و اہلِ کیں   ڈھونڈ اہلِ دیں، بن ان کا ہم نشیں

کرگسوں کا رسم و آئیں اور ہے
سطوتِ پروازِ شاہیں اور ہے

ہے درودِ مردِ حق مانندِ برق   اس کا ایندھن شہر و دشت و غرب و شرق
ہم ہیں اب تک صیدِ فتراکِ حیات   وہ شریکِ اہتمامِ کائنات
وہ کلیمؑ اور وہ مسیحاؑ، وہ خلیلؑ   وہ محمدؐ، وہ کتاب اور جبرئیلؑ
آفتابِ کائناتِ اہلِ دل؛   اس کی ضو سے ہے حیاتِ اہلِ دل؛
آگ میں اپنی جلاتا ہے تجھے   پھر وہ سلطانی سکھاتا ہے تجھے
سوز سے اس کے ہی صاحب دل ہیں ہم   ورنہ کیا ہیں، نقشِ آب و گل ہیں ہم
یہ زمانہ جس میں تو پیدا ہوا   غرقِ تن ہے جان سے نا آشنا
قحطِ جاں سے جب بدن ارزاں ہوا   مردِ حق خود ذات میں پنہاں ہوا
پا سکے اس کو بھلا کب جستجو   لاکھ اس کو دیکھیے اپنے روبرو
تو نہ ذوقِ جستجو لیکن گنوا   گرچہ ہو سو مشکلوں کا سامنا
گر نہ تجھ کو قربِ مردِ حق ملے   مجھ سے تو سرمایۂ اجداد لے
پیرِ رومی کو رفیقِ رہ بنا   تاکہ بخشے سوزِ جاں تجھ کو خدا!

مانتا ہے رومی فرقِ مغز و پوست
اس کی دنیا اس کی منزل کوئے دوست

پڑھ لیا اس کو، مگر سمجھا نہیں
ہاتھ معنی کا غزال آیا نہیں

مثنوی سے رقصِ تن سیکھا مگر
رقصِ جاں سے موڑ لی سب نے نظر

رقصِ تن گردش میں لائے خاک کو
رقصِ جاں برہم کرے افلاک کو

رقصِ جاں سے علم و حکم آتے ہیں ہاتھ
اور زمین و آسمان و کائنات

فرد اس سے صاحبِ جذبِ کلیمؑ
ملت اس سے وارثِ ملکِ عظیم

رقصِ جاں کا سیکھنا دشوار ہے
ترکِ غیرِ حق کب آساں کار ہے

حرص و غم سے گر جلے تیرا جگر
رقص میں آتی نہیں جاں اے پسر

ضعفِ ایمانی ہے، دل گیری ہے غم
سچ تو یہ ہے نیمۂ پیری ہے غم[ا]

حرص کیا ہے فقرِ حاضر[ب] کا ہے نام
خود پہ جو قاہر ہو، میں اس کا غلام

اے کہ تو تسکینِ جاں، نورِ نظر
رقصِ جاں سے تو اگر ہو بہرہ ور

سرِ دینِ مصطفےٰؐ تجھ سے کہوں
قبر میں بھی میں دعائیں تجھ کو دوں

ا۔ اَلْہَمُّ نِصْفُ الْہَرَم
ب۔ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: ایاکم والطمع فانہٗ الفقر الحاضر

توضیحات و تعلیقات

۱۔ جاوید نامہ کے آغاز ہجر و فراق کے مضامین سے ہوتا ہے۔ انسانی وجود اپنے "کل" یعنی ذاتِ حق سے جدا ہو کر درد فراق میں تڑپ رہا ہے۔ اس ساری کائنات میں کوئی بھی انسان کا غمگسار نہیں۔ پہاڑ، دریا، چاند، ستارے، سب گونگے بہرے ہیں۔ انسان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں اس شکوے میں شکر کا پہلو بھی ہے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا در پردہ اظہار بھی۔ کیونکہ اس کائنات میں صرف انسان ہی اس شعورِ ذات کے شرف سے سرفراز ہوا ہے کہ میرا ایک علیحدہ مستقل وجود ہے اور میں اپنے وجود حقیقی یعنی ذات باری سے جدا ہوں اور مجھے پھر اس سے ملنا ہے یہی معراج ہے اور "جاوید نامہ" کا موضوع بھی۔

انسانی وجود کا اپنے کل یعنی ذاتِ حق سے جدا ہونا اور پھر اس سے ملنے کے لیے آرزو کرنا اور تڑپنا کچھ صوفیانہ تصورات کا آئینہ دار بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو قرآن پاک میں انسان اور کائنات کی تخلیق کے بارہ میں سادہ طور پر یوں فرما دیا تھا کہ

اِذَآ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (سورہ ۳۶ یٰسین، آیت ۸۲)

تاکہ عام آدمی بھی سمجھ سکے قرآن پاک میں تخلیق کائنات کے مسئلہ کو فلسفیانہ انداز میں بیان نہیں کیا گیا تھا لیکن صوفیا نے اس میں خاصی موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں کیں اور متکلمانہ انداز میں تخلیق کائنات پر روشنی ڈالی ہے ان کے خیال میں اس کائنات میں وجود صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے وجود ذاتِ باری تعالیٰ کیونکہ وجود کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں کسی اور کا محتاج نہ ہو یعنی قائم بالذات ہو۔ کائنات میں کوئی وجود ایسا نہیں جو سلسلۂ علت و معلول کا پابند نہ ہو سوائے

وجودِ ذاتِ باری ہے جو قائم بالذات ہے اور واجب الوجود ہے۔ باقی ہر وجود ممکن الوجود ہے اعتباری ہے یعنی اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں بلکہ جو نظر آتا ہے وہ محض فریبِ نظر ہے۔ اس کی مثال صوفیاء نے یوں دی ہے کہ رسی کے ایک سرے کو آگ لگا کر اگر گھمایا جائے تو دائرہ معلوم ہوتا ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

وجودِ حقیقی جسے ذاتِ بحت[1] بھی کہتے ہیں اس سے انسانی روح کا اشراق بتدریج ہوا ہے جسے تنزلات کہتے ہیں اور جو بعض صوفیا کے خیال میں چھ ہیں جنہیں تنزلاتِ ستہ کا نام دیا جاتا ہے ویسے یہ تنزلات کا نظریہ خاصا قدیم ہے۔ فلاطینوس[2] (۲۰۴ء) نے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ذاتِ بحت کائنات سے ماوراء ہے اس سے بتدریج عقلِ اول، روحِ کل، روحِ انسانی اور مادہ کا اشراق ہوا ہے۔ اگر انسان استغراق و تفکر سے کام لے تو اس کی روح مادے کی کثافت و آلائش سے نجات پا کر مبداءِ حقیقی سے جا ملتی ہے۔ اس عمل کو تنزل اور صعود، انفعال اور انجذاب کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ روحِ انسانی اپنے مبداءِ حقیقی سے ملنے کے لیے بے قرار رہتی ہے۔ اس بیقراری کو فلاطینوس نے عشق کا نام دیا ہے۔

مسلمان صوفیاء کے خیال میں حق تعالیٰ نے اس حدیثِ قدسی کے مطابق

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

عالمِ تنزیہہ سے عالمِ شہود میں مختلف مراتب میں جلوہ فرمایا۔ ان مراتب کو تنزلات کہتے ہیں یعنی ذاتِ حق نے مقامِ لاتعین سے سب سے پہلے تعینِ اول کی جانب تنزل[3] فرمایا۔ اسی کا نام مقام

۱۔ ذاتِ بحت — بحت کے معنی محض، صرف اور خالص کے ہیں۔ ذاتِ باری کا نو فلاطونی تصور جس کو شنکر برہما کہتا ہے اور جسے حضرت ابن عربی وجودِ مطلق کہتے ہیں۔ اقبال کا علم کلام۔ جناب سید علی عباس جلالپوری۔

۲۔ اقبال کا علمِ کلام۔ جناب سید علی عباس جلالپوری

(حاشیہ ۳، اگلے صفحہ پر)

وحدت ہے ۔ ابنِ عربی نے اسی کو حقیقتِ محمدیہ بھی کہا ہے ۔ اس کے بعد مقام واحدیت ہے ۔ پھر مقامِ روح و مثال و جسم ہے ۔

صوفیاء کے نزدیک انسانی معراج یہ ہے کہ جس طرح ذاتِ حق نے مرتبۂ اطلاق سے مرتبۂ انسان تک نزول فرمایا اسی طرح انسان اپنے مقامِ انسانیت سے ترقی کرتا ہوا مقام الوہیت تک پہنچ جائے جسے وہ فنافی اللہ یا بقا باللہ بھی کہتے ہیں اور یہی معراج انسانیت ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ جاوید نامہ بھی اسی موضوع پر ایک بے مثل کتاب ہے ۔

(بقیہ حاشیہ ۳)

یہاں لفظ نزول لغوی معنی میں نہیں اعتباری معنوں میں مستعمل ہوا ہے ۔ کیونکہ نزول سے تو مراد یہ ہے کہ جب کوئی ایک مقام سے دوسرے مقام میں نزول کرتا ہے تو پہلے مقام میں وہ نہیں ہوتا ۔ حالانکہ حق تعالیٰ الآن کما کان کی شان والا ہے ۔ وہ تمام ظاہری اور باطنی مراتب میں بیک وقت موجود ہے ۔

(نقد اقبال ۔ میکش اکبرآبادی)

۱۔ وحدت الوجود کے بارہ میں لکھنے سے یہ مراد نہیں کہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ علامہ وجودی تھے یا جاوید نامہ تصوف کی کتاب ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ چونکہ جاوید نامہ کا موضوع معراجِ انسانی اور مشاہدۂ ربانی ہے ۔ اس موضوع کے کچھ فنی تقاضے بھی تھے جس کے لیے علامہ نے تصوف کے افکار سے استفادہ کیا اور بہت سی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں جس طرح علامہ نے فلسفہ سے اپنے پیغام کی فکری بنیادوں کو مستحکم کیا ہے اسی طرح تصوّف سے جوش و مستی ، سوز و گداز اور اثرانگیزی کا عنصر اپنے پیغام میں شامل کیا ہے ۔ اس لیے وضاحت کے طور پہ وحدت الوجود کے فلسفہ کے بنیادی نکات پیش کر دیے تاکہ عام قاری پس منظر سے آگاہ ہو سکے ۔

۲۔ غیب (بالفتح) (ع) غائب ہونا۔ خدا۔ فرشتہ۔ راز۔ جو چیز اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے پوشیدہ رکھے۔ ذاتِ حق مقام احدیت میں جہاں بغیر تعینات کے ہے۔

حضور بضمتین (ع) ضدِ غیب حاضر ہونا، کلمۂ تعظیم۔ موجودگی۔ حاضر باشی۔ مقام وحدت ذاتِ حق تعین کے پردے میں عالم میں جلوہ گر ہے۔

ہے بے خودی ہی جس سے ہوتا ہے قرب حاصل
غائب جو آپ سے ہو، پائے حضور تیرا (امیر)

غیب و حضور تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ اپنے نفس اور خلق سے غائب ہونا اور حق تعالےٰ کے حضور میں حاضر رہنا بھی حضور ہے ۔ ۔ ۔ صوفیاء کے خیال میں ذات حق مرتبۂ احدیت میں غیب مطلق ہے لیکن ذات حق سراپا حسن بھی ہے اور حسن کا تقاضا ظہور ہے اس لیے وہ بلباسِ تعینات خارج میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کائنات ذاتِ حق کے جلووں ہی کا ظہور ہے ۔ قرآن پاک میں ہے ۔ هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۔ وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ غالب۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مقامِ احدیت میں ذاتِ حق بغیر تغیر کے ہے یعنی اسے ثبات ہے یا جسے الآن کہا کان۔ (اب بھی وہی ہے جیسا پہلے تھا) کہتے ہیں۔ اور ذاتِ حق تعینات کے پردے میں ہر وقت تغیر میں ہے یعنی ہر گھڑی نئی شان میں ہے جسے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (ہر روز اس کی نئی شان ہے) کہتے ہیں، یعنی ذات حق کے مختلف انداز ہیں کہیں غیب کی شان کے ساتھ ہے اور کہیں حضور کی شان کے ساتھ ہے۔

۳۔ مُرور (بضم میم) گزرنا جیسے مرور ایام۔ دنوں کا گزرنا

۴۔ آیت تسخیر۔ اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ (۴۵-۱۳)

ترجمہ: اور جو کچھ زمین میں ہے اور آسمانوں میں ہے وہ سب کچھ تمہارے واسطے اپنی طرف سے مسخر کیا۔

۵۔ عَلَّمَ الاسماء۔ آیت قرآن وَعَلَّمَ آدَمَ الاَسْمَاءَ کُلَّھَا (۳۱-۲) اور ہم نے آدم کو تمام نام سکھائے۔

تخلیقِ آدم کے سلسلے میں آدم کے خلیفہ بنانے پر فرشتوں نے اظہار خیال کیا تھا کہ آدم زمین پر فساد پھیلائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں حقیقت کا علم نہیں۔ آدم کو صفت علم سے نوازا گیا ہے اس لیے وہ خلافتِ ارضی کا مستحق ہے۔ علم الاسماء سے مراد غالباً اشیا کا تعقل اور تصور ہوگا۔ انسان اشیاء کی ماہیت سے آگاہ ہو کر کائنات کی تسخیر کرے گا۔

۶۔ اُدعوف۔ آیتِ قرآنی۔ وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُونِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ (۴۰-۶۰) تمہارے رب نے فرمایا کہ اے میرے بندے دعا کر میں تیری دعا قبول کروں گا۔

اس شعر میں اس بات کا اظہار ہے کہ خدا نے انسان کو برگزیدہ کر کے اپنا محرمِ اسرار بنایا یعنی عظمتِ شرفِ انسانی کا اظہار مقصود ہے۔

۷۔ مصرع۔ سامنے نظروں کے کیوں آتا نہیں۔ قرآن پاک میں رویتِ حق کے بارہ میں یہ بھی ہے لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ (۶-۱۰۴) آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ اور یہ بھی کہ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۷۵-۲۲،۲۳) کتنے چہرے اس دن تازہ ہیں اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے والے ہیں)۔۔ ان دونوں آیتوں میں مفسرین نے یوں انطباق کیا ہے کہ ادراک اور نظر میں فرق ہے۔ انسان جلوۂ حق پر نظر ڈال سکتا ہے لیکن اس کا ادراک نہیں کر سکتا چونکہ انسان حقیقتِ ذاتِ حق نہیں جان سکتا کہ خود رسولِ برحقؐ کا فرمان ہے مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ (میں تجھے نہ جان سکا جیسا کہ جاننے کا حق ہے)

۸۔ سحرِ سامری۔ سامری کا جادو۔ بعض کا خیال ہے کہ سامری جادوگر حضرت موسیٰ کے زمانے

میں قصبہ سامرہ (فلسطین) کا رہنے والا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحقیق یہ ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا۔ سمیری قوم میں گائے، بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال بھی تھا سامری کا واقعہ قرآن پاک کی سورت طٰہٰ میں تفصیل سے درج ہے۔

حضرت موسیٰؑ جب کوہ طور پر گئے اور اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے واسطے چھوڑ گئے تھے تو سامری نے بنی اسرائیل کو بہکا کر خدا پرستی کے بجائے بت پرستی کی طرف مائل کیا۔ اس نے سونے کا بچھڑا بنایا جو بولتا بھی تھا۔ چنانچہ تمام قوم نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ کہتے ہیں اس نے حضرت جبریلؑ کی گھوڑی کے پاؤں کی مٹی اٹھا کر اس بچھڑے کے پیٹ میں ڈال دی جو اس نے سونے اور چاندی سے بنایا تھا: بچھڑا زندہ ہو گیا اور بولنے لگا۔ حضرت موسیٰ کی اُمت کے اکثر لوگ اس کی پرستش کرنے لگے اور گمراہ ہو گئے

(فرہنگ آنندراج۔ قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ قصص القرآن صدرالدین بلاغی۔ قدیم تہذیبیں۔ عبدالمجید سالک۔ تمدن غلیقی عبدالواحد حیدرآباد۔ تاریخ ملل قدیمہ۔ انجمن ترقی اردو۔ ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد جلد دوم ص ۴۶۴، ۴۶۵

بحوالہ مطالعہ تلمیحات و اشارات اقبال ڈاکٹر اکبر حسین قریشی)

۹۔ (ع) جبر دیں کا عقل مجبوری کا نام

تجلی یعنی عشق حقیقی کے بغیر زندگی سراپا دکھ ہے کیونکہ بغیر عشق کے دین ایک جبر ہے اختیار نہیں۔ عاشق الٰہی اپنے اختیار سے اطاعت الٰہی کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں نائب الٰہی ہوں اور صاحب اختیار ہوں اس میں جوشِ عمل ہوتا ہے لیکن جو عاشق الٰہی نہیں ہوتا وہ دین پر جبراً عمل کرتا ہے۔ وہ مقصدِ حیات سے ناآشنا ہوتا ہے بالکل مشین کی طرح دین کے احکامات پر عمل کرتا ہے اس لیے مجبور ہوتا ہے اور اس کی عقل ذاتِ حق کی آشنائی سے بے بہرہ ہوتی ہے اس لیے مجبور بھی ہوتی ہے۔ یعنی خدا سے دور ہوتی ہے کیوں کہ بغیر عشق عرفان الٰہی ممکن نہیں۔

اِ۔ الف۔ عرش۔ دیکھئے توضیح نمبر ۲۵۸

۱۰۔ اِنّی قَرِیْبٌ ۔ آیت قرآنی ۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنّیْ فَاِنّیْ قَرِیْبٌ (۱۸۲ - ۲)
(اے رسولؐ جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو بتا دے کہ میں نزدیک ہوں)
اس شعر میں خدا سے شکوہ کیا گیا ہے کہ اے خدا تیرا تو ارشاد ہے کہ میں اپنے بندوں کے قریب ہوں لیکن میں جدائی سے تڑپ رہا ہوں ۔

۱۱۔ مصرع   آنکھ ہے جبریل سے بیدار تر
معراج رسول پاکؐ کی طرف اشارہ ہے ۔ چشم بیدار تر کا تصور اس آیت قرآنی سے ماخوذ ہے
مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۵۳ - ۱۷) نہ آپ کی نگاہ میں کجی پیدا ہوئی نہ اپنے مرکز سے ہٹی ۔

۱۲۔ مصرع   گرچہ نافرماں ہے اور خوں ریز ہے
اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے
اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ
(۲ - ۳۰) کیا تو (خلیفہ) زمین میں اس کو بناتا ہے جو فساد کرے (زمین میں) اور خون بہائے گا اور ہم پاکی بیان کرتے ہیں تیری تعریف کے ساتھ اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں ۔

۱۳۔ مصرع   دیکھتا ہے جلوہ ہائے کائنات
اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (تحقیق اس میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں)
(۳۰ - ۲۴)

۱۴ ذات وصفات ۔ ذات مونث (عربی) صاحب مالک (خداوند) ۔ ہر چیز کی حقیقت (معنی عین) جوہر جسم ۔ ذات حق
خدا کی ذات کا علم حاصل کرنا ممکن نہیں ۔ رسول خدا اور بزرگان دین نے حقیقت ذات کے بارہ میں غور و فکر کرنے سے منع فرمایا ہے ۔ حضور کا فرمان ہے

لاتفکّر وفی اللہ فتھاکو (اللہ کی ذات میں تفکر سے کام نہ لو ہلاک ہو جاؤ گے) شیخ اکبر ابن عربی کا قول ہے

کل الناس فی ذات اللہ حمقا (ذات حق کے جاننے میں ہم سب احمق ہیں) صوفیا کا قول ہے خدا کی ذات آیات سے روشن نہیں بلکہ آیات اس کی ذات سے روشن ہیں۔ یعنی انسان صفات و آیاتِ حق سے ذاتِ حق کو پہچان سکتا ہے۔

۱۵۔ یہ شعر مثنوی سے لیا گیا ہے

۱۶۔ یہ نظم زبورِ عجم سے لی گئی ہے

۱۷۔ اس مصرع میں انسان کو شعر سے تشبیہہ دی گئی ہے جس طرح شعر کا مضمون پہلے دماغ میں آتا ہے پھر آہستہ آہستہ غور و فکر کے بعد شعر موزوں ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی آہستہ آہستہ اپنی خودی میں کامل ہو کر یعنی موزوں ہو کر نیابت خداوندی کے لائق بنتا ہے۔

۱۸۔ لعلِ مذاب۔ لعل لال کا معرب ہے۔ سرخ قیمتی پتھر۔ مذاب پگھلا ہوا لعلِ مذاب سرخ رنگ کی شراب کو بھی کہتے ہیں۔

۱۹۔ عمان۔ پاکستان و ایران کے جنوب اور عربستان کے مشرق میں ہے۔ ایک سمندر اور خلیج بھی ہے جو بحرِ عمان ہی کا حصہ ہے۔

شنیدم من کہ اندر ماہ نیساں

صدف بالا رود از قعرِ عمان (گلشن راز) (فرہنگ معین)

۲۰۔ نورِ جیب موسیٰ عمران۔ حضرت موسیٰ کے معجزے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بغل میں ہاتھ دے کر باہر نکالتے تو وہ سورج کی طرح چمکتا تھا پھر ناتھا الخ۔ اس شعر میں شیخ سے مراد دیوجانس کلبی ہے

۲۱۔ دیوجانس کلبی Deogenes یا سی نکس۔ سی نکس یونانی زبان میں کتے بھونکنے کو کہتے ہیں چونکہ اس فرقے کے حکما کو اپنے اس طرز زندگی پر بڑا گھمنڈ تھا کہ ہم مال و دولت وغیرہ سے نفرت کرتے ہیں اس لیے ان کی ترش روئی اور بدمزاجی کی وجہ سے

ان کو سی نکس کہا جاتا ہے ـــــ دیوجانس اسی فرقے کا مشہور حکیم ہے سنہ ۴۱۲ ق م میں پیدا ہوا اور ۹۶ برس کی عمر میں وفات پائی۔ یہ تارک الدنیا تھا۔ ایک لکڑی کا پیالہ سر پر اٹھائے پھرا کرتا تھا (خم افلاطون کی جو ادب میں روایت ہے وہ اسی ہی کی صورت معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ خم افلاطون کا تاریخ میں کوئی وجود نہیں)۔ دیوجانس کو جو مل جاتا کھا لیتا اور اس پیپے میں بیٹھ کر آرام کر لیتا۔ یہ شہر کارنتھ کا رہنے والا تھا۔ جب سکندر نے شہر کارنتھ کو فتح کر لیا تو اس کی ملاقات کو گیا۔ یہ پڑا سو رہا تھا۔ سکندر نے اسے ٹھوکر مار کر کہا تو پڑا سوتا ہے اور میں نے تیرا شہر فتح کر لیا۔ اس نے کہا، شہروں کا فتح کرنا تو بادشاہوں کا کام ہے لیکن لات مارنا گدھوں کی خصلت ہے۔ سکندر ایک روز اس سے ملنے گیا وہ دھوپ کھا رہا تھا۔ سکندر نے کہا کوئی خدمت فرمایئے اس وقت دیوجانس اور سورج کے درمیان سکندر کا جسم حائل تھا) اس نے کہا بس یہی خدمت ہے کہ آپ اپنا سایہ میرے سر سے ہٹا لیجئے۔ اس کے بارہ میں مشہور ہے کہ وہ ایک روز دن کے وقت چراغ ہاتھ میں لیے ایتھنز کے گلی کوچوں میں گھومتا پھرتا تھا اور کہتا تھا انسان کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

۲۲۔ رستم و دستان۔ رستم کے باپ زال کو دستان بھی کہتے ہیں۔

۲۳۔ رومی۔ مولانا جلال الدین رومی۔ فارسی کے مشہور شاعر جو اس خیالی آسمانی سفر میں علامہ کے رہنما ہیں (پیدائش ۶۰۴ھ وفات ۶۷۲ھ) (ادب نامۂ ایران بدخشانی)
نیز دیکھئے توضیح نمبر ۳۳

۲۴۔ شیب۔ بالوں کا سفید ہونا۔ بڑھاپا

۲۵۔ نورِ سرمدی۔ سرمد کے معنی ہیں دایم۔ ابدی۔ نورِ سرمدی۔ نورِ ابدی، نورِ خداوندی

۲۶۔ اس کے لب پہ سرِ پنہانِ وجود ـــــ مثنوی مولانائے روم کی تعریف کی گئی ہے جس میں وحدت الوجود کے مسائل اور حقایقِ حیات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جس کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ وجود مطلق نیستاں کی طرح ہے اور روح انسانی "نے" کی مانند

ہے جو نیستاں یعنی وجود مطلق سے جدا ہو کر بیقرار ہے اور وصال کی آرزو مند ہے۔

۲۷۔ کی بپا روزِ الست اک بزم جب ــــ یعنی خداوند تعالیٰ کو بھی اپنی انفرادیت قائم رکھنے
کے لیے الست بربکم (سورت ۷، آیت ۱۷۲) (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں)
کی شہادت طلب کرنا پڑی۔

۲۸۔ شاہد۔ گواہ۔ چشم دید گواہ۔ (فارسی میں معشوق و محبوب) (نشان یا استعارۃً نشانی) اس
آیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱-۲۱)
خود تمہاری ذات میں نشانیاں ہیں اگر تم غور کرو۔ خودی کے بارے میں دیکھیے توضیح اضافی نمبر ۲۸۳

۲۹۔ اَمر و خلق۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷-۵۴)
امر حکم کرنا۔ خلق، پیدا کرنا۔ امر سے مراد روح بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے
قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۷-۸۵) اے نبیؐ کہہ دو روح امر ربی ہے۔
عالم امر سے مراد انسان کا روحانی وجود اور عالم خلق سے مراد انسان کا جسمانی وجود ہے۔

۳۰۔ اِلَّا بِسُلْطَانٍ اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔
یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵-۳۳)
(اے جن و انس کے گروہ اگر تم ہماری حدود و سلطنت یعنی) آسمانوں اور زمین کے کناروں
سے باہر چلے جانے کی طاقت رکھتے ہو تو نکل جاؤ (مگر اتنا سمجھ لو کہ) بغیر قوت اور غلبہ کے
تم باہر نہیں جا سکتے
اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ دنیا میں باعزت زندگی کے لیے قوت و غلبہ کی ضرورت ہے

۳۱۔ غیب و حضور دیکھیے توضیح نمبر ۲

۳۲۔ عقل و عشق۔ تصورات عقل و عشق علامہ اقبال کے افکار کی بنیاد بھی ہیں اور مرکزی نقطہ بھی
مختصراً یوں ہے کہ عقل و عشق خبر و نظر اور علم و وجدان علامہ کی نظر میں ایک دوسرے کی

ضد نہیں بلکہ دونوں ہی ایک حقیقت کے دو رخ ہیں۔ عقل محسوسات کے ذریعہ حقیقت تک پہنچتی ہے اور عشق و وجدان براہ راست ادراکِ حقیقت کرتے ہیں۔ وہ مسائل جنہیں مابعد الطبیعیات کہتے ہیں یعنی انسان کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ حشر و نشر کیا ہے اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ عقل کی دسترس سے باہر ہیں ان مسائل میں عشق و وجدان اس کی دستگیری کرتے ہیں لیکن مادی دنیا کے مادی مسائل پر عقل کی سیادت ہے۔ جہاں عقل و نظر پہ زور دیا جاتا ہے وہاں مادہ پرستی کا زور رہتا ہے اور روحانیت دم توڑ دیتی ہے اور جہاں عشق و وجدان کو اہمیت دی جاتی ہے وہاں روحانیت چھا جاتی ہے۔ اور زندگی عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے وجدان کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے اور علم کو وجدان کے ذریعے زیادہ یقینی بنانا چاہیئے اور دونوں میں توازن و اعتدال ہی کسی معاشرے اور انسان کو مقام اکملیت تک پہنچا سکتے ہیں۔ نیز دیکھئے توضیح اضافی نمبر ۲۸۴

۳۳۔ رومی۔ مولانا جلال الدین رومی۔ (۶۰۴-۶۷۲) فارسی کے مشہور شاعر۔ تصانیف مثنوی دیوان غزلیات نثر، فیہ مافیہ وغیرہ۔ رومی علامہ اقبال کے اس خیالی آسمانی سفر میں رہنما ہیں —— اس سفر میں سب سے پہلے انہی کی روح رونما ہوتی ہے اور اسرار معراج بیان کرتی ہے۔ دوسری ارواح سے روح رومی ہی علامہ اقبال کا تعارف کراتی ہے —— رومی کی جانب سے علامہ کو اس سفر میں زندہ رود کا خطاب ملتا ہے —— علامہ اقبال رومی سے بے حد متاثر تھے انہیں وہ اپنا مرشد معنوی سمجھتے ہیں۔ علامہ کے تمام افکار پر مولوی رومی کے فکر و فن کی گہری چھاپ ہے —— مولانا روم اور علامہ اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔

(۱) دونوں اعلیٰ درجہ کے شاعر ہیں (۲) دونوں اسلام کے داعی ہیں (۳) دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے (۴) دونوں معقولات کے سمندر کے تیراک ہونے کے باوجود عشق کو

ا۔ (انگریزی) خطبات علامہ اقبال خطبہ ۱۔ ص ۲۔ مطبوعہ ۱۹۷۷ء

معقولات پر ترجیح دیتے ہیں یعنی عقل پر عشق کی برتری کو مانتے ہیں (۵) دونوں نفی خودی کے بجائے تقویتِ خودی کے قائل ہیں (۶) دونوں خودی اور بیخودی کو ایک دوسرے کے لیے لازم جانتے ہیں۔ (۷) دونوں کے خیال میں انسانی افعال جزوی طور پر پہلے ہی سے خدا کی طرف سے مقرر اور مقدر نہیں بلکہ تقدیر آئینِ حیات کا نام ہے (۸) دونوں جدوجہد کو زندگی اور بے عملی کو موت سمجھتے ہیں (۹) دونوں ارتقائی مفکر ہیں، نہ صرف انسان بلکہ تمام موجودات ادنیٰ سے اعلیٰ منازل کی طرف عروج کر رہی ہیں۔ انسان کے عروج کی کوئی حد نہیں (۱۰) دونوں قرآن کریم کے آدم کو نوعِ انسانی کی معراج کا نصب العینی تخیل سمجھتے ہیں

(اقبال کامل) (حکمائے اقبال) (تاریخ ادبیات ایران از شفق)

۳۴۔ نان جو سے عشق الخ حضرت علیؓ کی طرف اشارہ ہے کہ حضرتؓ جو کی روٹی کھاتے تھے اور انھوں نے قلعۂ خیبر فتح کیا تھا۔

۳۵۔ حضرت ابراہیم اور نمرود کے واقعہ کی طرف تلمیح ہے۔ عام روایت ہے کہ نمرود کی ناک میں ایک مچھر گھس گیا تھا جس سے اس کی موت واقع ہوئی۔

دوسرے مصرع میں حضرت رسول پاکؐ کے معجزہ شقِ قمر کی طرف اشارہ ہے

۳۶۔ لشکرِ فرعون روندا۔ الخ

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ (۲-۵)

جب پھاڑا ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو پس بچالیا تم کو اور ڈبویا فرعون کو)

حضرت موسیٰ اور فرعون کے واقعہ کی طرف تلمیح ہے۔

۳۷۔ نغز (بفتح نون) خوب و لطیف ۳۸۔ چغز (بفتح نون) غوک مینڈک

۳۹۔ یہ شعر مثنوی مولانائے روم کا ہے۔

۴۰۔ ونے جاناں محملِ جان ہے بدن —— تن روح کی ہی ایک شکل ہے اس کا علیحدہ وجود نہیں۔ مادہ بھی روح ہی ہے جو بقیدِ زمان و مکان متشکل ہو کر اپنے مقام کو حاصل کر رہا ہے (خطبات) اسی نکتہ کو گلشنِ راز جدید میں یوں واضح کیا ہے

تن وجاں را دو تا گفتن کلام است
تن وجاں را دو تا دیدن حرام است

۱۴۔ زروان ـــــ زروان کے معنی زمانے کے بھی ہیں۔ دوپہر کے بھی دیری اور درازی وقت کے بھی۔ اوستا میں زروان سے مراد فرشتۂ زمانِ بے کراں مراد لیا ہے اور چند بار زروان کا دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ ایران کے عہد قدیم میں اھورا مزدا کو زروان کا خالق سمجھا جاتا تھا لیکن ساسانی عہد میں زروان کو خالق و پروردگار کا مرتبہ دے دیا گیا اور یوں زروان پرستی نے رواج پالیا۔ یہاں تک بعض محققین کے خیال میں عہد ساسانی میں زرتشت مذہب اور زروان پرستی ایک ہی چیز ہے۔ زروانی عقائد کے مطابق زروان اکرانہ (بے کرانہ۔ غالباً یہ الف نفی کا وہی ہے جو لفظ اجیت اٹل ہندی سنسکرت زبان میں ہے) خدائے بزرگ اور خالق اھورامزدا اور اہرمن ہے۔ زروان اکرانہ نے ایک ہزار سال تک قربانیاں دیں تاکہ اس کے ایک لڑکا پیدا ہو جس کا نام وہ اھورا مزدا رکھے۔ لیکن آخر میں اسے اپنی قربانیوں کے بارے میں شک ہو گیا۔ پس دو لڑکے اس کے بطن میں رونما ہوئے ایک اھورا مزدا چونکہ اس نے قربانی دی تھی۔ دوسرا اہرمن چونکہ اس نے شک کیا تھا۔ زروان نے یہ عہد کیا تھا کہ دنیا کی بادشاہی ان دونوں میں سے اسے عطا کرے گا جو پہلے اس کے حضور میں آئیگا اہرمن نے باپ کا سینہ چیر کر خود کو باپ کے حضور میں پیش کیا۔ زروان نے پوچھا تو کون ہے؟ اہرمن نے جواب دیا۔ "میں تیرا بیٹا ہوں"۔ زروان نے کہا میرا بیٹا تو خوشبو اور نور والا ہے اور تو سراپا تاریکی اور بدبو ہے"۔ اسی اثنا میں اھورمزدا بھی اپنے نورانی اور معطر پیکر کے ساتھ نمودار ہوا۔ زروان نے اسے فوراً پہچان لیا کہ یہی میرا لختِ جگر ہے اور اپنے بیٹے سے کہا۔ "اب تک میں نے تیری راہ میں قربانیاں دی ہیں اس کے بعد تجھے چاہیئے کہ میرے لیے قربانیاں دے"۔ اہرمن نے کہا۔

"ابا جان آپ اپنا یہ وعدہ پورا کیجیے کہ سلطنت عالم بیٹوں میں سے اس کو ملے گی جو پہلے حاضر ہوگا" زروان نے جواب دیا کہ عالم کی سلطنت، نو ہزار سال تک اہرمن کو ملے گی اس کے بعد اہورامزدا تنہا عالم کا حکمران رہے گا۔[۵]

شہرستانی نے ملل و نحل میں زروانیہ فرقے کے بارہ میں تفصیل سے لکھا ہے اور ان کے عقائد کے بارے میں بہت سی روایات لکھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ زروان اعظم نے نو ہزار نو سو ننانوے سال عبادت و ریاضت کی تاکہ اسے ایک بیٹا مل جائے۔ جب ایسا نہ ہوا تو عالم کے باب میں اس کے دل میں شک پیدا ہو گیا۔ پس اہرمن اسی شک کی پیداوار ہے اور اہورامزدا نے عالم یقین سے جنم لیا ہے دونوں ایک ہی ماں کے بطن میں تھے۔ اہورامزدا کی جب ولادت کا وقت آیا تو اہرمن مکاری سے ماں کا پیٹ چاک کر کے اہورامزدا سے پہلے باہر آ گیا اور عالم پر قبضہ کر لیا۔ بعض روایات میں ہے کہ زروان کی بیوی بھی تھی جس کا نام "دخوشنزک" تفاخوش کا مصغر ہے

مختصر یہ کہ زروان زمان ناپیدا کنار کی ایک تمثیل ہے۔ جو کام اس عالم میں انجام پذیر یا اس جہان میں جو حال ظاہر ہوتا ہے اس کی صورت پذیری زمان و مکان ہی کے اندر ہوتی ہے جو کچھ ہے زمان و مکان میں ہے اس سے باہر کسی شئے کا وجود نہیں۔[۶]

زروان کو زروان اکنارگ بھی کہتے ہیں جس سے مراد زمان سرمدی و نامتناہی ہے۔

زروانِ بزرگ۔ یعنی پہلوی زبان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام ہے۔

(فرہنگ آنند راج) نیز دیکھئے توضیح ۲۸۵

۲۴۔ روشن اور بیدار چہرے سے کنایہ ہے زندگی اور تاریک و محو خواب چہرے سے کنایہ ہے موت

۲۴۔ پروں کا مختلف رنگ کا ہونا سے زندگی کی مختلف کیفیات اور شائبہ مراد ہیں۔

۵۔ ایران در عہد ساسانیان از کرسٹن سین۔ ص ۹۵۔ ۶۔ ایضاً

۴۴۔ یعنی زمانہ ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔

۴۵۔ یعنی اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہوں اور اپنے افعال و آثار کے اعتبار سے ظاہر ہوں

۴۶۔ پھول کا کھلنا، دانہ کا درخت بننا، محبوب کا فراق اور اس کا وصال یہ سب واقعات زمان ہی میں رونما ہوتے ہیں۔

۴۷۔ لی مع اللہ اشارہ ہے حدیث پاک کی طرف "لی مع اللہ وقت لایسعنی فیہ نبیٌ مرسل وملک مقربٌ" (مجھے ذات باری کے ساتھ ایسا وقت نصیب ہوتا ہے کہ اس میں نہ نبی مرسل اور نہ مقرب فرشتہ بار پا سکتا ہے)

۴۸۔ کلیات۔ کلیہ کی جمع۔ (۱) منطق کی اصطلاح ہے معنی اصول (۲) دیوانِ شاعر۔ یہاں منطق کی اصطلاح کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یعنی صاحبِ شوق و آرزو، عقلی استدلال اور فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھنے کے بجائے جلوہ ہائے دوست سے لطف اندوز ہوتا ہے

۴۹۔ قمر۔ چاند (ایک سیارہ) فارسی ماہ۔ ہندی سوم فلک اول اسے غام فلک بھی کہتے ہیں

۵۰۔ خافقین و بلدرم کے متعلق علامہ نے جاوید نامہ کے حاشیہ میں لکھا ہے

"کوہ ہائے آتش فشانِ قمر" ظاہر ہے یہ نام فرضی ہیں۔

۵۱۔ بلدرم دیکھئے توضیح نمبر ۵۰

۵۲۔ وشوامتر۔ وشوا۔ تمام۔ متر۔ دوست۔ یعنی جہاں دوست وشوامتر، راجہ رام چندر جی کا اتالیق تھا وہ علم و حکمت میں نادرۂ روزگار تھا۔ اسے گائتری کا مصنف مانا جاتا ہے

۵۳۔ یعنی اس وادی کے پتھر دھاری دار تھے۔ زنار بند شاید اس لیے کہا ہے کہ وشوامتر ہندو ہونے کی وجہ سے خود بھی زنار بند تھا۔

۵۴۔ رنگ، عالم کی مادی حیثیت یعنی کیفیت و کمیت کی طرف اشارہ ہے اور بے رنگی سے مراد بساطت ہے یا مطلقیت ہے یعنی خدا رنگ و بو اور تعینات و تشخصات سے بری

اور پاک ہے۔

۵۵۔ سنگِ فسن (فسن) (بفتح فا) وہ پتھر جس پر تلوار یا چاقو تیز کرتے ہیں اسے فارسی میں سان، فسان یا افسان بھی کہتے ہیں۔

۵۶۔ چشم برحق باز کردن زندگی است — اسی سے ملتا جلتا شعر ہے

برمقامِ خود رسیدن زندگی است

ذات رابی پردہ دیدن زندگی است

۵۷۔ قشمرود۔ چاند کے پہاڑوں میں ایک پہاڑ کا (فرضی) نام

۵۸۔ زہرہ (بضم سا) اسے ناہید بھی کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کا نام سکر ہے۔ فلک سوم۔ زمین سے نزدیک ترین سیارہ ہے اسے رقاصۂ فلک اور مطربۂ فلک بھی کہا جاتا ہے ادبی روایت ہے کہ زہرہ ایک مغنیہ تھی۔ دو فرشتے ہاروت و ماروت جو آزمائش کے لیے دنیا میں بھیجے گئے تھے اس کی عشوہ فروشی کا شکار ہو گئے سزا کے طور پر ایک کنوئیں میں لٹکا دیئے گئے۔ ساری دنیا کا دھواں ان کے نتھنوں میں جاتا ہے۔ زہرہ پھر آسمان پر سیارہ بنگئی رقص و سرود، عشق و محبت، ناز و ادا اس سے منسوب ہیں۔

۵۹۔ چاہِ بابل۔ قرآن پاک میں ذکرِ ہاروت و ماروت۔ سورۃ بقرہ (۲-۱۵۲) میں ہے عام ادبی روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے عہد میں دو فرشتے ہاروت و ماروت آزمائش کے لیے زمین پر بھیجے گئے۔ زمین پر وہ ایک مغنیہ کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ یہ عورت جس کا نام زہرہ تھا ان سے اسمِ اعظم پوچھتی تھی۔ یہ فرشتے نہ بتاتے تھے۔ ایک روز اس عورت نے دھوکے سے انہیں شراب پلا دی۔ نشے کی حالت میں انھوں نے اسمِ اعظم بتا دیا اسمِ اعظم کی تاثیر سے وہ عورت آسمان پر جا کر زہرہ ستارے (سیارے) میں جا بیٹھی اور ان فرشتوں کو سزا کے طور پر چاہِ بابل میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ سارے جہان کا دھواں ان کے نتھنوں میں جاتا ہے۔

۶۰۔ علامہ ہی کا ایک شعر ہے ؎

درد عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سِرّی از اسرارِ عشق

(دنیا میں ہر جگہ عشق ہی کے آثار ہیں خود انسان بھی عشق ہی کا ایک راز ہے۔)

اور بقولِ رومیؒ

اوست عینِ جملہ اشیا ای پسر
با تو گفتم رازِ پنہاں سر بسر

"یہ کائنات سالمات کی حرکت غیر شعوری سے لے کر انسان کی حرکت تک یعنی یہ پوری کائنات انائے کبیر حق تعالیٰ کا جلوۂ ذات ہے۔" "اقبال"

۶۱۔ ایضاً

۶۲۔ عالم یعنی کائنات نقشِ آب کی طرح ہے جو بظاہر نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ جس طرح غوطے میں نقشِ آب حائل نہیں ہوتا اسی طرح یہ عالم، یہ کائنات انسان اور خدا کے درمیان حائل نہیں۔ یہ تعینات کی وجہ سے غیر نظر آتا ہے حالانکہ یہ بھی جلوۂ حق ہی ہے جس طرح نقشِ آب بھی آب ہی ہے۔

۶۳۔ یعنی وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے۔

۶۴۔ اشیا کا اختلاف دکھانا مقصود ہے۔ ایک چیز کسی کے لیے زہر ہے کسی کے لیے تریاق۔ گِل یعنی مٹی پھول کے لیے تریاق ہے لیکن انسان کے لیے زہر ہے۔

۶۵۔ سروش۔ فرشتہ۔ حضرت جبرئیلؑ۔ پہلوی زبان میں یہ لفظ سروشا ہے جس کے معنی ہیں اطاعت و فرمانبرداری۔ اس کی اصل لفظ "سرو" ہے جس کے معنی ہیں سننے کے۔ اسی سے سرودن بنا ہے اوستا میں سروش سے مراد مقدس فرشتہ ہے۔ ہر مہینے کے سترہویں دن کو روزِ سروش کہتے ہیں (فرہنگِ آنندراج برہانِ قاطع)

۶۶ - وجود و شہود۔ تصوف میں وجود وہ ہے جو قائم بالذات ہے یا جو واجب الوجود ہے اور وہ صرف ذاتِ حق ہے باقی ہر شے اس کی تجلی کا ظہور ہے۔ یہ عالم بھی عالمِ شہود ہے یعنی بظاہر موجود ہے غور کرو تو اس کا وجود کچھ بھی نہیں اس لیے اسے نیرنگ یا طلسمِ شہود کہا ہے

۶۷۔ جسے اس کی حضوری نصیب ہو اس کی نظر میں ہر ذرّہ بھی طور ہے۔ ورنہ آنکھ کسی شے میں خدا کے ظہور و نور کو نہیں دیکھ سکتی۔

۶۸۔ یعنی تو عقل کے ذریعے حقائق کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے جو ناممکن ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی سراب میں کشتی چلائے۔ صوفیا کا قول ہے العلم حجاب الاکبر (علم سب سے بڑا حجاب ہے)

۶۹۔ یہاں رازی عقل کی علامت ہے جس طرح رومی عشق کی علامت ہے ع

جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی

رازی۔ امام فخرالدین ابو عبداللہ محمد بن عمر بن حسین الرازی (۵۴۳ - ۶۰۱) امام صاحب منطق، فلسفہ اور علم کلام کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ تفسیر قرآن ان کی معرکۃ الآرا کتاب ہے جس میں انہوں نے فلسفہ اور منطق کے دلائل سے معتزلہ کے عقائد کی تردید کرنے کی کوشش کی جس سے یہ تفسیر فلسفہ اور کلام کی معتبر کتاب بن گئی لیکن قرآن کریم کی روح کہ وہ کتابِ زندگی ہے اور دستورِ حیات ہے اور انسان کو جوشِ عمل اور عشقِ خدا و رسولؐ بخشتی ہے، اس تفسیر میں موجود نہیں۔

۷۰۔ خوشبو گلاب میں۔ اشارہ ہے اس مصرع کی طرف ع

او در من و من در او چو بو بگلاب اندر

یہ مصرع اس شعر کا ہے ؎

اے زاہدِ ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی
او در من و من در او چوں بو بگلاب اندر

یہ شعر نصیر الدین چراغ دہلوی کا ہے۔ اس غزل کا آخری شعر ہے۔

در سینہ نصیر الدین جز عشق نمی گنجد
این طرفہ تماشا بین دریا بحباب اندر

علامہ نے صوفیا کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ فنا فی اللہ مقصودِ حیات ہے بلکہ بقا باللہ یعنی تسخیرِ کائنات مقصودِ حیات ہے ؎

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بی پردہ دیدن زندگی است

(زندگی درحقیقت اپنے مقامِ نیابت کو پانا ہے اور خود کو بے پردہ دیکھنا ہے)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

۷۱۔ یرغمید، وادیِ یرغمید۔ فرضی نام

۷۲۔ نجم و نور و نازعات۔ قرآن کریم کی سورۂ والنجم، سورۂ نور اور سورۂ النازعات

۷۳۔ طواسین جمع طاسین کی۔ عربی حروفِ تہجی کے دو حروف ہیں۔ انہی دو حروف سے قرآن پاک کی ایک صورت نمل کا آغاز ہوا ہے۔ یہ حروف مقطعات ہیں۔ ان کے حقیقی معنی صرف اللہ ہی کو معلوم ہیں یا عارفین کو۔ البتہ جہاں تک قیاس کا تعلق ہے طا سے کوہ طور اور سین سے وادیٔ سینا مراد ہے جو طور سینا کا مخفف ہے چونکہ طور سینا پر خداوند تعالیٰ نے تجلی فرمائی تھی اس لیے طس سے مراد تجلّی ربانی ہے نیز حسین بن منصور حلاج کی ایک کتاب کا نام طواسین ہے جس میں اس نے مختلف ابواب کا نام طاسین رکھا ہے جیسے طاسین السراج، طاسین الفہم وغیرہ

۷۴۔ دلیل بفتحِ دال، رہنما، مرشد، حجت اور برہان

۷۵۔ رُسل جمع رسول۔ پیغمبر۔

۷۶۔ گوتم بدھ کا نام سدھارتا تھا اس کے قبیلہ کا نام گوتم تھا۔ اس کا باپ سدھودھن نیپال کا راجہ تھا جب اسے عرفان حاصل ہوگیا تو وہ بدھ کہلایا۔ بدھی عقل کو کہتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس کا زمانہ ۴۸۳ - ۵۶۳ ق م ہے۔ ۲۰ سال کی عمر میں اس کی شادی شہزادی یشودھرا سے ہوئی جس سے ایک لڑکا پیدا ہوگیا۔ گوتم بدھ نے نوجوانی خوب عیش و آرام میں گزاری۔ ۲۹ سال کی عمر میں اس نے چار خواب دیکھے۔ ایک میں بوڑھے کو دیکھا دوسرے میں ایک بیمار آدمی کو دیکھا تیسرے خواب Vision میں ایک لاش دیکھی، چوتھے میں ایک تارک الدنیا مقدس ہستی کو دیکھا۔ ان خوابوں سے اس کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہوگئی کہ زندگی کا انجام بڑھاپا اور موت ہے اور یہ کہ اسے ترکِ دنیا کر کے عرفان کی روشنی حاصل کرنا چاہیئے۔ ۶ سال تک مسلسل جنگلوں میں آوارہ پھرنے، مجاہدہ اور ریاضت شدید کے بعد شہر گیا جو صوبہ بہار میں ہے کے قریب ایک بڑ کے بہت بڑے درخت کے نیچے اسے نروان (عرفان) حاصل ہو گیا۔

بدھ کی تعلیمات میں بظاہر خدا کا تصور موجود نہیں۔ اس کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ انسان بار بار پیدا ہوتا ہے اور اس چکر سے تمناؤں اور خواہشوں کو ترک کر کے ہی رہائی حاصل ہو سکتی ہے۔ جو شخص اس چکر سے نکل جاتا ہے اسے نروان حاصل ہو جاتا ہے اس کی تعلیمات کی بنیاد عام مسلمہ اخلاقی اقدار پر مبنی اصولِ ہشت گانہ ہیں

۱۔ پاک عقیدہ	۲۔ پاک ارادہ
۳۔ پاک گفتگو	۴۔ پاک رفتار
۵۔ پاک روزی	۶۔ پاک کوشش
۷۔ پاک توجہ	۸۔ پاک تصوّر

بدھ مت نے بڑی جلدی ترقی کی اور دور دور تک پھیل گیا۔ جاپان اور چین میں اس

مت کی ایک صورت رائج ہے۔ یونانیوں کے حملے کے بعد جب آرٹ کا دبستان برصغیر میں قائم ہوا جسے گندھارا (قندھار) دبستان کہتے ہیں بدھ کے بڑے بڑے مجسمے ڈھالے گئے۔ مختلف عجائب گھروں میں اب تک یہ مجسمے نظر آتے ہیں۔

گوتم بدھ نے ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

The World Book Encyclopaedia B.V.2

۷۷۔ یہ غزل زبور عجم سے لی گئی ہے۔ ص ۲۰۱ کلیات ۵۱۲

۷۸۔ زرتشت کا پورا نام زرتشت سپتمان ہے زرتشت یعنی وارندہ شتر (اونٹ رکھنے والا) بظاہر یہ اس کے قبیلہ کا نام تھا۔ سپیت مان۔ سپیت = سفید، مان = خاندان۔ یعنی سفید خاندان یا وہ شخص جو سفید نسل سے تعلق رکھتا ہو۔

زرتشت کی شخصیت تاریخی کم اور روایتی زیادہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ۶ ہزار سال قبل مسیح پیدا ہوا۔ بعض اس کا زمانہ ۱۲۰۰ ق م اور بعض ۶۰۰ ق م بتاتے ہیں۔ اوستا اس کی مذہبی کتاب ہے اس کے صحیفوں میں قدیم ترین کتاب گاتھا ہے یہ وہی کلام ہے جس نے گاتھا کی صورت اختیار کی اور جو گیتا کی شکل میں موجود ہے اس کے مذہب کی بنیاد تین اصولوں پر ہے جو یہ ہیں۔

۱۔ کردار نیک

۲۔ گفتار نیک

۳۔ پندار نیک

نیز نور وظلمت اور اہرمن و یزداں کی کش مکش پر اس کا نظریۂ مذہب مبنی ہے

۷۹ اہرمن۔ شیطان۔ زرتشتیوں کے مذہب میں اہرمن فاعلِ شر ہے جبکہ یزداں فاعلِ خیر ہے۔ نیز دیکھئے توضیح ۲۸۷

۸۰۔ زبیب۔ خشک انجیر

۸۱۔ ارہ وکرم وصلیب

اَرّہ۔ آرا حضرت زکریاؑ کے شہادت کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت زکریاؑ بنی اسرائیل کے پیغمبر تھے۔ اُن کا ذکر قرآن پاک کی چار سورتوں، آل عمران، انعام، مریم اور انبیاء میں آیا ہے۔ حضرت زکریاؑ حضرت داؤد کی اولاد میں سے تھے اور ان کی زوجہ "ایشاع" حضرت ہارون کے خاندان میں سے تھیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے نجار تھے۔ حضرت زکریا کی بیوی "ایشاع" اور حضرت مریم کی والدہ "حنہ" دونوں حقیقی بہنیں تھیں اسی لیے وہ حضرت مریم کے کفیل بنے تھے۔ حضرت زکریاؑ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ بیوی بانجھ تھیں۔ دعاؤں کے نتیجے میں بڑھاپے میں حضرت یحییٰ پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ کہ "اس زمانے کے بادشاہ ہداد بن حدار نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور پھر اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا حضرت یحییٰ سے فتویٰ طلب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "اب یہ عورت تجھ پر حرام ہے" ملکہ نے اس فتوے سے ناراض ہو کر آپ کو شہید کرا دیا۔ حضرت یحییٰ کو شہید کر کے جب یہود حضرت زکریاؑ کو قتل کرنے کے لیے آئے تو وہ بھاگ کر ایک درخت کے تنے میں گھس گئے۔ یہود نے درخت پر آرا چلا کر درخت کے ساتھ حضرت زکریاؑ کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے" مصدقہ نہیں۔ اسرائیلی روایت میں ہے البتہ ادبی روایت بن چکا ہے۔

کرم (کاف کا زیر) کیڑا۔ حضرت ایوبؑ کے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ صبر ایوبؑ مشہور ہے۔ ان کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ لیکن پھر بھی صابر و شاکر رہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (۲۱۔ انبیاء۔ ۸۳)

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ (۳۸ ص ۔۴۱)

صلیب۔ حضرت عیسیٰ کی صلیب کی طرف اشارہ ہے۔ عیسائیوں کے عقاید کے مطابق ان کی شہادت صلیب پر ہوئی تھی۔ لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ مصلوب نہیں ہوئے بلکہ

اللہ کے حکم سے آسمان پر اٹھا لیے گئے

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ (۴ ۔النساء ۱۵۷)

۸۲۔ نور دریا ، ساحل اس کا تیرگی ـــــ ذاتِ خداوندی مثل نور ہے

(اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) (القرآن ۲۴۔۳۵) (خود مذہب زرتشت کی بنیاد بھی نور و ظلمت پر ہے۔ نور یزداں ہے اور ظلمت یا تاریکی یا تیرگی اہرمن ہے) یہ نور سمندر کی طرح ہے جس کا ساحل تیرگی (ظلمت) یعنی اہرمن ہے اور انسان اس سمندر کا سیلِ تند ہے۔ اس شعر میں نہایت خوب صورتی سے ذاتِ حق کی وحدانیت پر اثر ڈالے بغیر خدا کے ساتھ انسان اور شیطان کے وجود کو علامہ نے ثابت کیا ہے۔

۸۳۔ نقشِ بیرنگی ـــــ نقشِ بیرنگی سے مراد نقشِ حق یا نقشِ دین ہے یعنی شیطان کو مار کر ہی دین کا یا حق کا رنگ قائم ہو سکتا ہے۔

Leo Nikolyenich Tolstoy

۸۴۔ طالسطائی

روس کا مشہور ناول نگار مفکر اور مصلح ـــــ ٹالسٹائی کے بارے میں علامہ نے ایک نظم بعنوان "ٹالسٹائی" پیامِ مشرق میں لکھی ہے۔ ص ۳۶۶ کلیات نیز دیکھیے توضیح ۲۸۸

۸۵۔ دریائے سیماب میں جو نوجوان ہے اس سے مراد یہوداہ اسقروطی ہے جو حضرت عیسیٰ کا حواری تھا جب یہودیوں نے سازش کر کے یہودیہ کے گورنر فلاطوس کو حضرت عیسیٰ کے خلاف بھڑکایا اور اس نے حضرت عیسیٰ کی گرفتاری کا حکم دیا تو اس یہوداہ اسقروطی کی غداری ہی سے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کیا گیا تھا (انجیل یوحنا باب ۱۳، آیات ۲۱۔۲۷)

(قصص القرآن از حفظ الرحمٰن جلد چہارم ۸۸۔۱۰۹)

۸۶۔ افرنگین۔ بظاہر مغربی تہذیب و ثقافت ہے، اقوام یورپ جنہوں نے عیسیٰؑ کی تعلیمات

کو بھلا دیا۔

۸۷۔ مغرب کی مادہ پرستی اور لادینیت کی طرف اشارہ ہے۔

۸۸۔ ابوجہل ۔ نام ابن الہشام المغیرہ لقب ابو الحکم ۔ مسلمانوں میں ابوجہل کے نام سے مشہور ہے ۔ بنو مخزوم قبیلہ کا سردار تھا ۔ حضرت رسول پاکؐ کا سب سے بڑا مخالف اور دشمن ۔ غزوۂ بدر میں واصل جہنم ہوا۔

۸۹۔ منات ۔ عرب کی ایک مشہور دیوی ۔ تقدیر کی دیوی ۔ قرآن پاک میں اس کا ذکر آیا ہے (دیکھئے سورۂ والنجم) منات ، لات اور عزّٰی کو عرب خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے۔

لات ۔ عرب کی ایک دیوی ۔ سورج کی دیوی ۔ اس کا بت خانۂ کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔

The Encyclopaedia of Islam by Houtsma and others

ابوسفیان جنگ احد میں لات اور عزّٰی کے بت اپنے ساتھ لایا تھا۔

لات و منات اور عزّٰی کا ذکر قرآن پاک میں ہے

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (سورۂ والنجم)

۹۰ احمر ۔ سرخ رنگ ۔ مراد سرخ نسل کے لوگ

اسود ۔ سیاہ رنگ ۔ سیاہ نسل کے لوگ

اعجمی ۔ غیر عرب

۹۱۔ سلمانؓ ۔ حضرت سلمان فارسیؓ مجوسی نام Mah Beh ماہ بہہ یا روز بہ Ruz Beh تھا۔ مشہور صحابی ۔ غزوۂ خندق میں آپ نے اہم کردار ادا کیا تھا ۔ آپ کے مشورہ سے حضورؐ نے خندق کھدوائی تھی ۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران کے ساتھ جنگوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ۔ مدائن کے گورنر بنے ۳۵/۳۶ ہجری میں وفات پائی ۔

آپ اصفہان کے رہنے والے تھے ۔ گھر سے تلاش حق میں نکلے ۔ مختلف عیسائی راہبوں

کی صحبت اختیار کی۔ ایک راہب نے مرتے وقت آپ کو حضرت رسولؐ کی بعثت کے بارے میں پیش گوئی کی۔ آپ حضرت رسولؐ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ راہ میں ڈاکوؤں نے آپ کو غلام بنا کر بیچ دیا۔ جب مدینہ آئے اور حضرت رسولؐ کو دیکھا فوراً پہچان لیا اور ایمان لے آئے۔ صحابہ نے آپ کے مالک کو رقم دے کر آپ کو آزاد کرایا۔ حضرت رسولؐ پاک کی نظر میں آپ بہت عزیز تھے۔ آپ کو اہلِ بیت کا درجہ حاصل تھا۔ جس طرح حضرت بلالِ حبشیؓ اور حضرت صہیب رومیؓ اسی طرح حضرت سلمان فارسی بھی جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل سے پاک عالمگیر اخوت کا بہترین نمونہ تھے۔ یہ آپ ہی نے تاریخی جملہ فرمایا تھا کہ "میں سلمان بن اسلام ہوں"۔[1]

۹۲۔ مزدک ـــــ مزدک کے باپ کا نام بامداد تھا۔ مدرنہ کا رہنے والا تھا۔ مدرنہ عراق کے علاقہ میں ایک بستی تھی۔ مزدک کا ظہور نوشیروان کے باپ کیقباد کے زمانے میں ہوا۔ مزدک سے دو سو سال قبل ایک شخص جس کا نام "زردشت بوندہ" تھا جس کے باپ کا نام خرگانِ تھا اور جو پسایاف کا رہنے والا تھا اور مانوی مذہب رکھتا تھا اس نے ایک دین دریست دین کے نام سے تشکیل دیا تھا۔ مزدک نے اسی دین کی ترویج کی کوشش کی۔ ویسے دریست دین اور مزدکیت دونوں ہی مانوی مذاہب کی اصلاح شدہ شکلیں ہیں۔ علاوہ دوسرے عقائد کے مزدک نے ایک قسم کا اشتراکیت کا نظریہ بھی پیش کیا تھا اس کے عقیدے کے مطابق زر، زن اور زمین پر تمام لوگوں کا مشترک اور مساوی حق ہے۔ کیقباد کے بیٹے خسرو نے اسے قتل کیا اور انوشین روان یعنی غیر فانی کا خطاب پایا جو بعد میں نوشیرواں کے نام سے مشہور ہوا۔

۹۳۔ عترت (عین کا زبر) اولاد خاندان

۹۴۔ عدنان۔ عربوں کے جدِ امجد قریش کے مورثِ اعلیٰ کا نام

۹۵۔ سحبان۔ ابن زفر بن ایاس وائلی۔ عرب کا مشہور خطیب (ولادت ۵۴ھ) (۶۷۴ء)

The Encyclopaedia Islam by Houtsma V, IV

وفات ۹۴ھ ۔ حضرت امیر معاویہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ ایک بار زبن گھنٹے ایسی دلآویز تقریر کی کہ امیر معاویہؓ نے اس سے کہا "انت اخطب العرب" اس نے اس پر یوں اضافہ کیا۔ والعجم والجن والانس

۹۶۔ زہیر ابن ربیعہ (۵۳۰۔۶۲۷) عہد جاہلیت کا مشہور عربی شاعر۔ معلقات میں زہیر کا قصیدہ بھی شامل تھا۔

۹۷۔ ہُبل ۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے ہبل اور بعل ایک ہی ہیں (قصص القرآن ۔ از حفظ الرحمٰن ص ۳۵ ، جلد دوم) یہ بت انسانی شکل کا بنا ہوا تھا ۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ بت عراق سے لایا گیا تھا ۔ قریش اور بنو کنعان اس کی پوجا کرتے تھے ۔ اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا ۔ قریش نے سونے کا بازو لگا دیا ۔ اس کے پاس تیر پڑے رہتے تھے جن سے مشرکین مکہ فال نکالتے تھے ۔ فتح مکہ کے بعد دوسرے بتوں کے ساتھ اسے بھی منہدم کر دیا گیا

The Encyclopaedia of Islam by Houtsma

۹۸۔ اِنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَہ   قرآنی آیت (۵ ر ۸ ۔ ۶۹)

۹۸ الف ۔ عُطارِد (عین کا پیش اور رے کا زیر) سب سے چھوٹا سیارہ فارسی میں تیر ۔ انگریزی میں Mercury ہندی میں بدھ ادب میں منشیٔ فلک نام ہے فلک دوم سے منسوب ہے ۔ نجومی اسے منافق کہتے ہیں چونکہ سعد سیارے کے ساتھ اس کا اثر سعد اور نحس سیارے کے ساتھ اس کا اثر نحس ہوتا ہے ۔

۹۸ ب ۔ افغانی ۔ جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء ۔ ۱۸۹۷ء) (۱۲۵۴ھ ۔ ۱۳۱۴ھ) انیسویں صدی میں ملت اسلامیہ کا عظیم قائد ۔ شکیب ارسلان نے انہیں "قوموں کا مصنف" کا خطاب دیا تھا ۔ کابل کے نواح میں ایک گاؤں "اسد آباد" نامی میں پیدا ہوئے

تھے۔ ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسد آباد ہمدان میں پیدا ہوئے تھے[1]۔ ۱۸ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ پر عبور حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستان، حجاز اور مکہ کا سفر کیا۔ مصر بھی تشریف لے گئے۔ ان کے علم و فضل کا شہرہ پورے مصر میں پھیل گیا۔ جامعہ ازہر میں منطق و فلسفہ پر درس بھی دیا۔ شیخ محمد عبدہٗ اور دوسرے علماء ان کے درس میں شامل ہوتے تھے۔ ۱۲۹۶ھ میں مصر سے جلا وطن کر دیے گئے۔ ہندوستان، انگلستان اور فرانس کا سفر کیا۔ پیرس میں شیخ محمد عبدہٗ کے تعاون سے ایک اخبار عروۃ الوثقیٰ نکالا۔ ۱۳۱۰ھ میں سلطان عبدالحمید کی درخواست پر استانبول گئے وہیں انتقال ہوا۔ بعض کا خیال ہے کہ سلطان نے انہیں زہر دے دیا۔ ۴۵/۴۰ سال بعد افغانیوں نے ان کی لاش کابل میں لاکر دفن کی۔

ان کی مشہور تالیفات ۔ ۱۔ ابطالِ مذہب الدہریین

۲۔ الدین اساس المدینہ والکفر فساد العمران

۳۔ تاریخِ افغان

انہوں نے ملتِ اسلامیہ کو بیدار کرنے اور انہیں مغربی اقتدار سے آزاد کرانے اور مشرق میں جمہوری اقدار قائم کرنے کے سلسلہ میں بڑی جد و جہد کی۔ عالم اسلام کے اتحاد کے ایک بہت بڑے داعی تھے۔

۹۹۔ سعید حلیم پاشا۔ ۱۸۶۵ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں پاشا کا لقب ملا ۱۹۱۳ء میں ترکی کے وزیر اعظم بنے ۱۹۲۱ء میں شہید کر دیے گئے۔ قدرت نے انہیں ایک بلند پایہ مفکر کا دماغ اور سچے مسلمان کا دل عطا کیا تھا۔ حکمتِ قرآن پر ان کو کافی عبور حاصل تھا۔ ان کی نظر میں انسانیت کی فلاح کے لیے اسلام بہترین ضابطۂ حیات ہے

۱۔ لغت نامۂ دھخدا

۱۰۰۔ فضیل حضرت فضیل بن عیاض ایک بہت بڑے صوفی تھے۔ ابتدا میں ڈاکوؤں کے سردار تھے۔ توبہ کی اور تارک الدنیا ہو گئے اور تصوف میں وہ مقام پیدا کیا کہ ہارون الرشید بھی اُن کا معترف اور معتقد ہو گیا۔ کہتے ہیں ایک دن ہارون الرشید نے فضل برمکی سے کہا کہ مجھے کسی اہل اللہ کے پاس لے چلو۔ فضل برمکی حضرت سفیان عُیینہ کے پاس لے گیا دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون ہے جواب دیا کہ امیر المومنین ہیں۔ سفیان عُیینہ نے کہا آپ مجھے خبر کر دیتے مَیں خود حاضر ہو جاتا۔ ہارون نے فضیل سے کہا یہ وہ شخص نہیں جس سے مَیں ملنا چاہتا تھا۔ اس بات کی حضرت سفیان کو خبر ہوئی تو انہوں نے کہا ایسا شخص اس شہر میں فضیل ہے۔ ہارون اور فضل حضرت فضل کے گھر گئے۔ دروازہ پر دستک دی۔ پوچھا کون ہے۔ فضل نے کہا امیر المومنین ہیں۔ فضل نے کہا امیر المومنین کو مجھ سے کیا کام اور مجھے ان سے کیا سروکار ہے۔ فضل برمکی نے کہا اطاعتِ امیر فرض ہے حضرت فضیل نے کہا مجھے تشویق نہ دو۔ فضل نے کہا اجازت لے کر اندر آئیں یا حکماً آجائیں۔ فرمایا اجازت تو نہیں ہے لیکن اگر آنا ہے تو آجاؤ مجبوری ہے۔ ہارون اندر چلا گیا حضرت فضیل نے چراغ کو بجھا دیا۔ تاکہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔ ہارون نے ہاتھ آگے بڑھایا حضرت فضیل نے اس کا ہاتھ چھو کر کہا کہ کیا نرم و نازک ہاتھ ہے اگر آتشِ جہنم سے بچ جائے۔ یہ کہا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ ہارون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہارون نے حضرت فضیل سے کچھ نصیحت کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے فرمایا کہ تیرے جدِ امجد نے جو حضرت رسولِ پاکؐ کے چچا تھے حضرت رسولؐ سے درخواست کی کہ مجھے کسی علاقے کا حکمران بنا دیجئے حضورؐ نے فرمایا کہ مَیں تمہیں تمہارے نفس کا حکمران بناتا ہوں کیوں کہ دنیا کی حکومت تو روزِ محشر وجہِ ندامت بن جائے گی۔ حضرت فضیل کی وفات پر

حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ حضرت فضیل کی موت کے وقت زمین و آسمان حزن و ملال میں غرق تھے۔

۱۰۱ ۔ بوسعید ۔ ابوسعید ابوالخیر (۳۵۷ھ ۔ ۴۴۰ھ) مشہور صوفی اور رباعی گو شاعر ۔ سرخس اور ابیورد کے علاقے میں مہنہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ علوم معقول و منقول کی تحصیل کے بعد ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی نیشاپوری (متوفی ۴۱۲ھ) کے ہاتھ پر بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا ۔
شیخ کے احوال و اقوال و مقامات کا ذکر مشہور کتاب "اسرار التوحید فی مقامات شیخ ابی سعید" مولفہ محمد بن منور بن ابی سعید بن ابی طاہر بن ابی سعید ابوالخیر میں تفصیل سے موجود ہے ۔ بقول محمد منور ایک دفعہ حضرت شیخ ابی سعید ابوالخیر اور ابو علی سینا تین دن تک متواتر خلوت گزیں رہے ۔ جب بو علی سینا شیخ سے رخصت ہوئے تو شاگردوں نے بو علی سینا سے پوچھا کہ شیخ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ بو علی نے کہا ۔ "جو کچھ میں جانتا ہوں وہ دیکھتا ہے" ۔ شیخ ابوسعید کے مریدوں نے جب شیخ سے بو علی سینا کے متعلق دریافت کیا کہ آپ کی رائے کیا ہے تو شیخ نے فرمایا ۔ "جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ جانتا ہے" ۔
شیخ ابوسعید پہلے شاعر ہیں جنہوں نے تصوف کی اصطلاحات کے معنی متعین کیے اور تغزل کی زبان میں تصوف کے مطالب بیان کیے ۔ اور فارسی رباعیات کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے ۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ رباعیات صرف ان سے منسوب ہیں اور وہ شعر نہیں کہتے تھے ۔

۱۰۲ ۔ جنید ۔ ابوالقاسم بن محمد بن جنید نہاوندی ۔ لقب سید الطائفہ ۔ طاؤس العلماء ، قواریری ، زجاج ہے ۔ قواریری اور زجاج اس لیے کہتے ہیں کہ آپ کے والد آبگینے بیچتے تھے ۔ آپ شیخ سری سقطی کے مرید اور بھانجے تھے آپ کے طریقے کی بنا صحو پہ ہے ۔ صحو کے معنی ہوشیاری اور سکر کے معنی مستی ہیں ۔ حضرت جنید سماع و وجد نہ فرماتے تھے اور ظاہر و باطن میں شریعت کی پابندی کو لازمی سمجھتے تھے ۔ تاریخ وفات ۲۹۷ھ بعض کے مطابق ۲۹۹ھ ہے ۔

۱۰۳ بایزید۔ ابویزید طیفور بن عیسٰی آدم بن سروشان ۔ قصبہ بسطام میں پیدا ہوئے آپ کے دادا مجوسی تھے وہ اسلام لائے ۔حضرت بایزید سے سنت اور فرض کی تعریف دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ سنت دنیا کو ترک کر دینے کا نام ہے اور فرض سے مراد مولا کی محبت ہے۔ سال وفات ۲۶۱ ھ ہے ۔ بعض کے خیال میں ۲۳۴ ھ ہے۔

۱۰۴۔ النجم ۔ قرآن کی سورۂ والنجم ۔ سورۂ والنجم کا ذکر اس لیے ہے کہ اس میں معراج رسول پاکؐ کا ذکر ہے اور جاوید نامہ سے مناسبت بھی ہے کہ جاوید نامہ میں بھی ایک خیالی آسمانی سفر ہے۔

۱۰۵۔ زندہ رود ۔ فارسی میں زندہ کے معنی جاندار کے ہیں اور زے کے زبر مع فتح کے ساتھ یعنی ژندہ کے معنی عظیم و بزرگ ہیں ۔ رود اس بڑی نہر کو کہتے ہیں جو خشکی کو سیراب کرنے کے بعد دریا میں مل جاتی ہے ۔ رود کے معنی ساز کے بھی ہیں زندہ رود (زے کے زبر کے ساتھ) اصفہان کا مشہور دریا ہے جس کا پانی بقول محمد بادشاہ صاحب فرہنگ آنندراج "بغدوبت شہرۂ ہر شہر بلکہ زبدۂ انہار دہر است"۔

اس کے علاوہ زندۂ بیدار "حی بن یقظان" کا ایک کردار بھی ہے جو بو علی سینا کی عرفانی تمثیلی کہانی میں اس کے خیالی سفر میں بو علی سینا کا رہنما بنتا ہے۔

جاوید نامہ میں زندہ رود جو علامہ اقبال نے اپنا لقب اختیار کیا ہے ۔ مندرجہ بالا معنوں کی روشنی میں بڑی معنویت کا حامل ہے

۱۔ علامہ اقبال ایک عظیم شاعر بھی ہیں اور ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہنے والی بھی ہے اس طرح زندہ رود میں زندۂ جاوید ساز یا زندۂ جاوید شاعری کی معنویت موجود ہے

۲۔ علامہ کا کلام ملت اسلامیہ کے لیے بالخصوص اور اقوام عالم کے لیے بالعموم سرچشمہ آب حیات ہے جو انسانی ذہنوں اور زندگیوں کے لیے پیغام حیات بخش ہے اس طرح زندہ رود ایک بڑے دریا کی علامت و معنویت سے پُر ہے کہ دریا خشک اور

بنجر زمینوں کو سیراب و سرسبز و شاداب کرتا ہے۔ دریا کا سمندر میں جا کر ملنا اور علامہ کا حضورِ حق میں پہنچنا بھی باہمی ربط کا عکاس ہے۔

۳۔ جس طرح زندۂ بیدار یعنی حی بن یقظان بوعلی سینا کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح زندہ رود یعنی علامہ اقبال جاوید نامہ میں اہلِ عالم کی رہنمائی حقائقِ حیات کی جانب کرتے ہیں۔

زندہ رود کی توضیح کرتے ہوئے حضرت علامہ اقبال کے صاحبزادے جناب جاوید اقبال اپنی کتاب "زندہ رود" میں رقمطراز ہیں:

"زندہ رود نام اقبال نے اپنے لیے خود "جاوید نامہ" میں منتخب کر رکھا ہے۔ زندہ رود کے معنی بنتی ہوئی حیات آفریں ندی ہے۔ اقبال اسی کی تعریف میں فرماتے ہیں:

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رُکے جب تو سل چیر دیتی ہے وہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے وہ
ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اقبال کی حیات دراصل ان کی فکری زندگی کا ارتقا ہے جو ایک مستقل حال میں جاری اور رواں دواں ہے اور جسے موت چھو نہیں سکتی۔ وہ اپنی جسمانی زندگی کو غیر اہم سمجھتے تھے۔ اس لیے حیاتِ اقبال کو زندہ رود کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے زندہ رود نام بھی انہوں نے غالباً آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حوالے سے اپنے لیے چنا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اقبال جرمن شاعر گوئٹے کے بڑے مداح تھے۔ گوئٹے قرآنی تعلیمات اور حیاتِ طیبہ سے بے حد متاثر تھا، یہاں تک کہ اس نے پیغمبرِ اسلام پر ایک منظوم تمثیل تحریر کرنے کا ارادہ کیا لیکن صرف

ابتدائیہ ہی لکھ سکا۔ تمثیل کی تکمیل کی نوبت نہ پہنچی۔ اس ابتدائیہ یا نظم بعنوان نغمۂ محمدؐ میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے گفتگو کے دوران گوئٹے نبوت کی تشریح کے سلسلے میں آنحضورؐ کے لیے حیات آفرین جوئے آب کی تشبیہ استعمال کرتا ہے جس کا کام بہت سے ناتوں اور ندیوں کو اپنی آغوش میں لے کر سمندر یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانا ہے۔ اقبال نے یہ نظم پڑھی ہوئی تھی اور اس کی تشبیہات اور استعارات سے بخوبی واقف تھے بلکہ اس کا آزاد ترجمہ بھی پیام مشرق کی نظم جوئے آب میں کیا تھا۔ چونکہ وہ آنحضورؐ کو انسانِ کامل سمجھتے تھے اس لیے ان کے نزدیک ہر مسلمان کے لیے آنحضورؐ کے نقشِ قدم پر چلنا فرض تھا اسی جذبہ کے تحت انہوں نے جاوید نامہ کے روحانی سفر کے لیے اپنا نام "زندہ رود" منتخب کیا۔ (ص۔ ج۔ د۔ زندہ رود جلد اوّل)

۱۰۶۔ گیتی۔ جہان

۱۰۷۔ وطن

علامہ اقبال کا تصورِ وطنیت خالص اسلامی ہے۔ ان کی نظر میں وطنیت کا وہ تصور جو دوسری قوموں اور ملکوں کے ساتھ تعصب، نفرت اور رقابت کو جنم دیتا ہے مذموم ہے البتہ اپنی سرزمین سے محبت، جنم بھومی سے لگاؤ جو حبِ وطن ہے جو ایمان کی نشانی ہے کہ فرمانِ رسولؐ ہے۔ "حُبُّ الوطن من الایمان" ایک اخلاقی بلکہ فطری جذبہ ہے جو ہر مہذب اور شریف انسان میں ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے علامہ کا آبائی وطن کشمیر تھا اور وہ کشمیر کی محبت کا یہی پاک جذبہ دل میں رکھتے تھے۔ وہ انگلستان سے واپس آئے تو کشمیری انجمن اور اس کے بعد آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے سیکرٹری مقرر ہوئے (اقبال کامل ص ۷۵) ان کی نظر میں خاکِ وطن کا ہر ذرّہ دیوتا تھا[1]۔ علامہ اقبال کے خیال میں وطن رنگ اور نسل کے

۱۔ خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے۔

امتیازات انسانیت کی ارتقا میں رکاوٹ نہیں بلکہ ممد و معاون ہیں۔ اگر یہ امتیازات صالح جذبوں پر مبنی ہوں ورنہ وطنیت کا وہ تصور جو مغرب میں رائج ہے۔ وہ تو مخلوقِ خدا کو مختلف قوموں میں تقسیم کر کے اسلام کے ملی جذبہ کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(بانگِ درا ص ۱۶۱ ۔ کلیات ۱۶۱)

جاوید نامہ میں وہ وطن کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وطن سے اہلِ وطن کی نسبت مُسلّم ہے۔ کیونکہ اس کی مٹی ہی سے ملتیں نشو و نما پاتی ہیں۔

باوطن اہلِ وطن را نسبتی است
زانکہ از خاکش طلوعِ ملتی است

اور ساتھ ہی سورج کی تمثیل سے یہ واضح کرتے ہیں کہ اگرچہ سورج کی نسبت مشرق سے ہے کہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے لیکن وہ مشرق و مغرب سے آزاد ہوتا ہے اور تمام دنیا کو روشن کرتا ہے[1]۔ اسی طرح مسلمان کی نسبت کسی سرزمین سے ضرور ہوتی ہے لیکن وہ تمام دنیا کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ کسی خاص علاقے یا قوم کے ساتھ وہ خود

۱۔ اندریں نسبت اگر داری نظر — نکتہ بینی ژرف و باریک تر
در تب و تاب است از سوزِ درون — تا ز قیدِ شرق و غرب آید برون
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب — با تجلی ہای شوخ بی حجاب
بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست — تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روی نسبت خاوری است

کو وابستہ کر کے اپنی ذات کو محدود نہیں کرتا۔ اسی نکتہ کو علامہ نے بانگِ درا میں اپنی نظم "آفتابِ صبح" میں اپنی ذات کے حوالے سے یوں پیش کیا ہے ؎

بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں

نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں

اسرارِ خودی میں بھی اس نکتہ پر یوں روشنی ڈالی ہے کہ ہم مسلمان وطنیت کے مغربی تصور سے بالکل بیگانہ ہیں۔ ہماری مثال تو آنکھ کے نور کی طرح ہے جو دو آنکھوں میں رہتے ہوئے بھی ایک ہی رہتا ہے۔ ہم مسلمان تو پھول کی خوشبو کی طرح ہیں کہ پھول میں سینکڑوں پتیاں ہوتی ہیں لیکن خوشبو تو ایک ہی ہوتی ہے۔

ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم　　　چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم

چوں گلِ صد برگ ما را بو یکی است　　　اوست جانِ این نظام و او یکی است[4]

(اسرارِ خودی ص ۲۰ و ۲۱ کلیاتِ اقبال)

علامہ کی نظر میں ملت کی اصل کو وطن سے وابستہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پانی ہوا اور مٹی کو پوجنا شروع کر دے۔

اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ　　　باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ[5]

(اسرارِ خودی ص ۳ و کلیاتِ اقبال)

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ خواہ ایران میں ہو خواہ عراق میں خواہ پاکستان میں ہو خواہ حجاز میں روحاً قلباً ایک ہے "ایک نما یک بین و یک اندیش" ہے، ہم مسلمانوں کا انداز فکر، ہمارا مقصودِ حیات، ہمارا انجام ایک ہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم تو یک زبان و یک دل و یک جان ہیں جسم جدا ہیں لیکن دل ایک ہیں۔ اور یہ نعمت ہمیں توحیدِ خداوندی پر پختہ ایمان سے حاصل ہوئی ہے۔

تیر خوش پیکان یک کیشیم ما   یک نما یک بین یک اندیشیم ما
مدعای ما مآلِ ما یکی است   طرز و انداز خیال ما یکی است
ما ز نعمتہائی او اخوان شدیم   یک زبان و یک دل و یک جان شدیم [51]

(اسرارِ رموز۔ ص ۹۳۔ کلیاتِ اقبال)

وطنیت کے سیاسی یا مغربی تصور کو تو ہمارے رسول صادق و مصدوق نے اس طرح رد کیا کہ خود اپنے وطن مکّہ سے ہجرت فرمائی اور یوں مسلم قومیت کی بنیاد ڈالی۔

عقدۂ قومیّتِ مسلم کشود   از وطن آقائی ما ہجرت نمود [52]

(اسرارِ رموز۔ ص ۱۱۴۔ کلیاتِ اقبال)

لیکن اس مغربی تصورِ وطنیت نے بنی نوع انسان کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے انسان انسان سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ انسانیت ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گئی گویا انسانیت تو مٹ گئی اور قومیں باقی رہ گئیں۔ وطنیت کا یہ سیاسی تصور مغربی تہذیب کا تحفہ ہے۔

مردمی اندر جہاں افسانہ شد   آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند   آدمیت گم شد و اقوام ماند
تا سیاست مسندِ مذہب گرفت   این شجر در گلشنِ مغرب گرفت

وطن کے مغربی تصور سے علامہ اس قدر بیزار ہیں کہ خود جاوید نامہ ہی میں نادر شاہ افشار کی زبان سے پہلوی دور کے ایران کی وطن پرستی پر کڑی تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس نے وطن سے تعلق جوڑ لیا لیکن اپنی ذات کو بھلا دیا رستم سے محبت کرتا ہے لیکن حضرت علی حیدرؓ سے رشتہ توڑ لیا ہے۔

با وطن پیوست و از خود در گذشت
دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت

علامہ وطنیت کے اس مغربی تصور کو ملتِ اسلامیہ کے لیے سخت ضرر رساں سمجھتے ہیں وہ اس تصور کو خیبر سے تشبیہہ دیتے ہیں جسے ایک حیدرِ کرارؓ کی ضرورت ہے ؎

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرارؓ بھی ہے

اور حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں اس تصورِ وطنیت کے خیبر کا حیدرِ کرارؓ علامہ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔

۱۰۸ (الف) اشتراکیت۔ بنیادی طور پر تو اشتراکیت سے مراد یہ ہے کہ دولت اور ذرائع پیداوار کی ملکیت ذاتی نہ ہو بلکہ مشترک ہو اور معاشرہ میں تمام افراد کے حقوق مساوی ہوں۔ نہ کوئی حاکم ہو اور نہ محکوم ہر شخص کام کرے اور ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ ملے۔ معاشرہ ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو۔ دنیا میں سب سے پہلے جس شخص نے مساواتِ انسانی کا نعرہ بلند کیا ہوگا وہی پہلا اشتراکی ہوگا۔ جاوید نامہ میں شاید اسی لیے ابوجہل لعنۃ اپنے نوحہ میں حضرت رسول اکرمؐ کو مزدکی یعنی اشتراکی ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔ مزدک نے ایران میں غالباً سب سے پہلے اپنے مذہب کی بنیاد اشتراکیت پر رکھی اور زر، زن، زمین کی مشترک ملکیت کا مضحکہ خیز تصور پیش کیا۔[1] انیسویں صدی میں کارل مارکس نے اشتراکیت کو سائنسی بنیاد پر استوار کیا۔ لینن اور اسٹالن نے اسی اشتراکی نظامِ حیات کو روس میں بذریعہ عوامی انقلاب قائم کیا۔ اشتراکیوں کے خیال میں اشتراکی اقتصادی نظام ارتقا سے نہیں بلکہ بغاوت سے قائم کیا جا سکتا ہے

۱۔ مزدک سے پہلے افلاطون نے اپنی مشہور تصنیف مثالی ریاست میں اشتراکی خیالات پیش کیے ہیں بقول ول ڈیورانٹ صاحبِ داستان فلسفہ وہ ان یہودی پیغمبروں کی روایات سے متاثر ہوا جو کسی حد تک اشتراکی تصورات رکھتے تھے۔ (داستان فلسفہ ص ۵۶)

یہ لوگ طبقاتی جنگ اور انقلاب کو اشتراکیت کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں۔

بظاہر اشتراکیت اور اسلام میں چند ایک باتیں مشترک بھی ہیں۔ دونوں

۱۔ ارتکازِ دولت کو مذموم سمجھتے ہیں[1]

۲۔ ملوکیت کے خلاف ہیں

۳۔ اقتصادی نظام میں انسانی مساوات کے علمبردار ہیں اور ہر قسم کے امتیازات و استحصال کے خلاف ہیں

۴۔ مفادِ عامہ کو اقتصادی نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں اور جماعتی حقوق کو انفرادی حقوق پر مقدم سمجھتے ہیں۔

لیکن

۱۔ اسلام محدود انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے اور فرد کی آزادی، حرمت اور اس کی انفرادیت کو کچلتا نہیں بلکہ حدود اللہ کے مطابق ان کے فروغ کا علمبردار ہے۔

۲۔ اسلام بھی معیشت و معاشرت میں مساوات کا داعی ہے یعنی سب کو ملک و قوم کے ذرائع پیداوار پر مساوی حقوق حاصل ہیں اور کسی فرد کو دوسرے فرد پر کوئی برتری حاصل نہیں (ہاں برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے) اور اسلام اجازت دیتا ہے کہ ہر شخص اپنی کوشش سے اور ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جائز ذرائع استعمال کر کے جتنا چاہے رزق یا دولت حاصل کرے۔

افرادِ انسانی مختلف صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں یکسانیت اور مساواتِ مطلق

۱۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سورۂ توبہ)۔

۲۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ (سورہ حشر)

خود فطرت کے خلاف ہے۔ فطرت کو تکرار پسند نہیں۔ ہر نقشِ انسانی اپنے اندر ایک انوکھا پن رکھتا ہے یوں اسلام مساواتِ مطلق کے خلاف ہے۔

۲۔ اشتراکیت شیرِ حق کی آمریت قائم کرتی ہے جو سراپا قہر ہے اور اسلامی نظام وحیِ حق پر مبنی ہے۔ اور وحیِ حق تمام بنی نوع انسان کا فایدہ مدِنظر رکھتی ہے اس لیے سراپا مہر ہے۔

اسلام میں دنیا کے ساتھ دین، جسم کے ساتھ روح اور انسان کے ساتھ خدا کا تصور بھی ہے جسے علامہ نے لا والّا کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک مسلمان کی دعا میں فی الدنیا حسنۃ یعنی دنیا کی بھلائی کے ساتھ فی الآخرت حسنۃ یعنی آخرت کی بھلائی بھی ہے

علامہ نے ملوکیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف اور انسانی مساوات کے حق میں بڑے پرجوش اشعار کہے ہیں جس سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ علامہ اشتراکیت کے حامی تھے لیکن حقیقت کچھ یوں نہیں یہ تصویر کا ایک رُخ ہے ـــــ علامہ کو ہر وہ چیز جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی ناپسندیدہ اور نامرغوب ہے ملوکیت، جاگیرداری اور سرمایہ داری اسلام کے بنیادی اصول یعنی انسانی مساواتِ حریت و حرمت و اخوت کے منافی ہیں اس لیے انہوں نے ان کی مخالفت پوری شدت سے کی، علامہ کا وہ کلام جو بظاہر اشتراکیت کی حمایت میں معلوم ہوتا ہے درحقیقت وہ ملوکیت جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف پرجوش احتجاج ہے۔ اشتراکیت کو وہ اس حد تک پسند کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اسلام کی طرح ملوکیت، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف ہے لیکن وہ اشتراکیت کو اسلام کی اعلیٰ اقدار کے منافی بھی سمجھتے ہیں اور بنی نوع انسان کے لیے غیر مفید بلکہ مہلک تصور کرتے ہیں۔

جاوید نامہ میں علامہ نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اشتراکیت کی خوبیوں کو سراہا بھی ہے لیکن اسکی خامیوں کی نشاندہی کر کے اس پر کڑی تنقید بھی کی ہے اور اشتراکیت

کو قرآن پاک کے معتدل اور متوازن نظریۂ حیات کو اختیار کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ نے چند اہم نکتے بیان کیے ہیں۔

۱۔ اشتراکیت مساواتِ شکم پر مبنی ہے حالانکہ اخوت جو مساوات کی روح ہے اس کا مقام شکم نہیں دل ہے۔

۲ موجودہ مسلمانوں کا طرزِ حیات اور ہے اور حقیقی اسلامی زندگی اور ہے۔ مسلمانوں نے قرآنی نظام کو بھلا دیا ہے خود ہی انہوں نے قیصریت کو مٹایا اور خود ہی قیصریت کو قائم کیا۔ علامہ اشتراکیوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم ایسا نہ کرنا..... اشتراکیت نے پاپائیت، ملوکیت اور سرمایہ داری کے بتوں کو پاش پاش کر دیا لیکن حرف لا سے زندگی کا نظام فروغ نہیں پاتا اس کے لیے "اِلاّ" یعنی ایک خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا اقرار بھی ضروری ہے۔ یعنی صرف منفی نظریۂ زندگی سے بات نہیں بنتی اس کے ساتھ مثبت نظریۂ حیات کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ورنہ یہ انقلاب تعمیر نہیں سراسر تخریب ثابت ہوگا۔ علامہ نے اشتراکیوں کو لا سے اِلاّ تک آنے کی دعوت دی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے بارہ میں متوازن اور معتدل راستہ اختیار کرو۔ زندگی صرف روٹی کپڑا مکان ہی نہیں یعنی مادی ضروریات ہی پر مبنی نہیں جیسا کہ عام طور پر مغرب کا تصورِ حیات ہے اور نہ زندگی صرف روحانی تجربات میں مستغرق رہنے یعنی اللہ ہو اللہ ہو کرنے کا نام ہے، جیسا کہ مشرق کے عوام کا عام اندازِ خیال ہے۔ زندگی بغیر عقل کے ناکام ہے اور بغیر تصورِ عشق کے نامکمل، یہ ذکر بھی ہے اور فکر بھی ہے۔ یہ دلبری بھی ہے اور قاہری بھی، جلال بھی اور جمال بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کے امتزاج کا نام ہی حقیقی زندگی ہے جس کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ قرآن حکیم دنیا اور آخرت کے حصول پر یکساں زور دیتا ہے۔ قرآن پاک انسان کو اعتدال و توازنِ فکر و نظر بخشتا اور افراط و تفریط سے بچاتا ہے۔ صراطِ مستقیم، میزان، امت وسطیٰ کے قرآنی الفاظ

۱۰۸ب ملوکیت Imperialism اس حکمت عملی کو کہتے ہیں جس کے مد نظر سلطنت کی توسیع ہوتی ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں نوآبادیاں قائم کی جاتی ہیں۔ اس سے مراد شاہی بھی ہے۔ اسلام میں مقتدر اعلیٰ یا حکمران صرف اللہ تعالیٰ ہے لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳-۱۰۷) وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳-۱۸۹) اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷-۵۴) اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (۶-۵۷) وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ (۲-۲۴۷) قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ (۳-۲۶) یہ تمام آیاتِ مذکورہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اسلام میں اقتدار و بادشاہت صرف اللہ کی ہے اور یہ کہ اسلام میں ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

ملوکیت اسلام کے مزاج اور اصول دونوں کے خلاف ہے۔ بادشاہت میں بادشاہ کی اطاعت واجب ہے اور اسلام میں صرف اللہ کی اطاعت واجب ہے۔ حاکم یا امیر کی اطاعت اس وقت تک جائز ہے جب تک وہ احکاماتِ خداوندی کے مطابق حکم دیتا ہے۔

علامہ نے ملوکیت کو اشتراکیت کی طرح یزداں ناشناس اور آدم فریب کہا ہے دونوں ہی نظام انسان اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ دونوں ہی روشن تن اور تاریک دل ہیں۔ ایک ہاتھ سے روٹی چھین لینا ہے دوسرا بدن سے روح نکال لیتا ہے ___ ملوکیت پر علامہ سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہیں۔ جاوید نامہ ہی میں فرعون کے حوالہ سے فرماتے ہیں۔

چیست تقدیرِ ملوکیت؟ شقاق　　محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق

جاوید نامہ ہی میں حضورِ خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں ۔

از ملوکیت جہانِ تو خراب　　تیرہ شب در آستینِ آفتاب

ارمغانِ حجاز میں فرماتے ہیں ۔

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است　　از و ایمن نہ رومی نے حجازی است
حضورِ تو غمِ یاران بگویم　　بامیدی کہ وقتِ دل نوازی است
ہنوز اندر جہان آدم غلام است　　نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آن گیتی پناہم　　کہ در دینش ملوکیت حرام است

مسلم مفکرین میں (بیدل یعنی میرزا عبدالقادر بیدل کو چھوڑ کر) سب سے پہلے علامہ اقبال ہیں جنہوں نے ملوکیت کے خلاف آواز بلند کی اور اسے اسلام کے خلاف بتایا اور صحیح اسلامی روح کو پیش کیا۔

علامہ جس طرح ملوکیت کو اسلام کے منافی سمجھتے تھے اسی طرح سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمینداری کو بھی اسلام کے روح کے خلاف جانتے تھے۔ خضر راہ (بانگِ درا) میں "سرمایہ و محنت" کے عنوان سے سرمایہ داری پر شدید تنقید کرتے ہیں۔ بانگ درا ہی میں فرماتے ہیں ؎

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار (۲۹۱، اردو کلیات)

انہی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

علامہ اشتراکیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے فکر کو قرآنی افکار کی روشنی سے منور کریں۔ ورنہ اشتراکیت بھی ملوکیت کی طرح یزداں ناشناس اور آدم فریب ہے ایک خروج یعنی بغاوت وکشت وخون ہے۔ دوسرا اخراج یعنی ظالمانہ ٹیکس ہے اور انسان ان دونوں پتھروں کے درمیان مثل زجاج (یعنی شیشے کی طرح) ہے۔ دونوں آب و گل میں غرق ہیں دونوں ہی کا تن روشن ہے لیکن دل سیاہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی صرف سوز ہی نہیں ساز بھی ہے۔ زندگی وہ ہے جو پتھروں کو بھی دل کا گداز عطا کرے۔ یعنی بُروں کو اچھا بنایا جائے۔ اشتراکیوں کی طرح مخالفوں کو تہ تیغ نہ کیا جائے بلکہ ان کی اصلاح کی جائے۔ یوں علامہ نے جاوید نامہ میں اسلام کے متوازن اور معتدل نظریہ حیات کو مفصل اور مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔

بال جبریل میں فرماتے ہیں ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات (ص ۱۸۱، بال جبریل)

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا

ارمغانِ حجاز میں فرماتے ہیں:

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین

بال جبریل میں "الارض للہ" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

وہ خدایا یہ زمین تیری نہیں میری نہیں
میرے آباء کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں!

(بال جبریل ص ۱۱۹) کلیات

سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

(ص ۴۰۲، بال جبریل کلیات)

علامہ سرمایہ داری اور ملوکیت کے خلاف تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اشتراکیت یا مغربی نظامِ حکومت کے حق میں تھے انہوں نے اشتراکیت اور مغربی نظامِ حکومت کی بھی شدید مخالفت کی ہے۔ علامہ اسلامی نظامِ حکومت اور اسلامی نظامِ معیشت کے حق میں تھے۔ انہوں نے جاوید نامہ میں بھی بالتفصیل اس پر بحث کی ہے اور اسلامی نظامِ حکومت و معیشت کو پیش کیا ہے جس کے بنیادی اصول یہ ہیں۔

۱۔ خلافتِ آدم ۲۔ حکومتِ الٰہی
۳۔ زمین خدا کی ملکیت ہے ۴۔ حکمت خیرِ کثیر ہے

۱۰۹۔ کارل مارکس ۔ ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوا ۔ اس کا باپ یہودی الاصل عیسائی تھا اس نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ وہ سب سے زیادہ ہیگل سے متاثر تھا ۔ اس کا نظریہ اشتراکیت مساوات پر مبنی ہے کارل مارکس کے نزدیک مساوات پیداوار کی صحیح تقسیم سے پیدا ہو سکتی ہے ۔ علامہ اقبال کے خیال میں مساوات صرف محبت سے پیدا ہو سکتی ہے اور انسانوں سے محبت وہی کر سکتا ہے جو انسانوں کے خالق سے محبت کرتا ہے ۔ اشتراکیت نے اپنے نظام کی بنیاد نفی یعنی لا الہ پر قائم کی ہے ۔ حالانکہ زندگی نفی و اثبات کا مجموعہ ہے ۔ الا اللہ کے بغیر زندگی نامکمل ہے ۔ خدا اور آخرت کے تصور کے بغیر انسانیت اور اخوت کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا ۔ انسان کی ضروریات صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ روحانی بھی ہیں ۔ اطمینانِ قلب بھی ایک چیز ہے جو صرف دولت سے حاصل نہیں ہو سکتا ۔ یوں اشتراکیت ایک نامکمل اور ناقص نظامِ حیات ہے ۔ ۱۸۸۲ء میں کارل مارکس نے وفات پائی ۔

۱۱۰۔ خروج بضم خا — باہر نکلنا — باہر جانا مراد ہے مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف اکسانا اور بھڑکانا اور ان کو تشدد اور قتل و غارت پہ آمادہ کرنا

۱۱۱۔ خراج بفتح خا — باج جزیہ ٹیکس — یعنی بادشاہ خراج وصول کر کے خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔

۱۱۲ زُجاج بضم زا — شیشہ ۔ آبگینہ

۱۱۳۔ مصطفےٰ کمال پاشا ۔ اتاترک کے نام سے مشہور ہے ۔ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا ۔ بچپن میں یتیم ہوا ۔ ملٹری سکول میں تعلیم پائی ۔ ان کی والدہ نے تھوڑی عمر میں ان کی شادی ایک دولتمند لڑکی سے کر دی ۔ تاکہ تعلیم کے اخراجات پورے ہو سکیں ۱۹۰۵ء میں فوج میں ملازمت اختیار کی ۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی حالت بڑی سقیم ہو گئی تھی ۔ اس کی کوشش جرأت

اور فراست سے انگریزوں کو شکست ہوئی ترکی کی حکومت بحال ہوئی اس نے ترکی میں سیکولر نظام قائم کیا عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط جاری کیا ۔ ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔

۱۱۴۔ محکمات

اس کا باطن ہر تغیر سے بری
اس کے ظاہر کو تغیر ہر گھڑی

یعنی قرآن کے اصول اٹل ہیں۔ البتہ فروعات میں اجتہاد کے ذریعے ملکی حالات اور عصری تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے ۔اس حقیقت کو قرآن پاک نے اس آیت میں بھی واضح کیا ہے۔

كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ

(۲۴-۱۴ ۔ سورۂ ابراہیم)

صوفیا نے اس حقیقت کو ذات وصفات کے رنگ میں بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ اپنی ذات میں الآن کما کان (اب بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا) ہے اور صفات میں كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (سورہ رحمٰن) ہے۔

۱۱۵۔ سام وحام ۔ حضرت نوحؑ کے لڑکوں کے نام

سام ۔ نوحؑ کا بیٹا جس سے سامی نسل منسوب ہے۔

حام ۔ نوحؑ کا بیٹا جو بربریوں، قبطیوں اور سوڈانیوں کا جدِ امجد ہے۔

طوفانِ نوح سے ان کے تین بچے بچ گئے تھے۔ سام ۔حام ۔ یافث ۔ روایات میں ہے کہ خشکی پر اترنے کے بعد حضرت نوحؑ کو نیند آگئی ۔اتفاقاً ہوا سے ان کا ستر کھل گیا۔ سام اور یافث نے اس کو ڈھانپ دیا۔ حضرت نوحؑ نے دعا دی کہ سام کی نسل سے پیغمبر اور یافث کی نسل سے بادشاہ پیدا ہوں گے لیکن حام جس نے باپ کا مذاق اڑایا تھا اس

کو بددعا دی کہ تیری اولاد میں جبشی غلام ہوں گے ۔ (واللہ اعلم بالصواب)

۱۱۶۔ انی جاعل ۔ آیتِ قرآنی ۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ (۳۱ - ۲۷)

۱۱۷۔ کن ۔ قرآنی آیت ۔ کن فیکون - ۵۹/۳ ۴۵/۱۹ ۱۱۷/۲ ۳۳/۶

۱۱۸۔ لن ترانی ۔ قرآنی آیت کی طرف اشارہ ہے ۔ (۱۴۲ ۔ الاعراف)

حضرت موسیٰؑ کے ربِّ ارنی (اے اللہ مجھے اپنا جلوہ دکھا) کے جواب میں اللہ تعالے نے فرمایا تھا۔ لن ترانی (تم مجھے نہیں دیکھ سکتے)

۱۱۹۔ لایراعی لایخاف ۔ نہ کسی کی رعایت کرتے ہیں نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔

۱۲۰۔ ناہی ۔ آمر ۔ ناہی / منع کرنے والا ۔ آمر / حکم دینے والا۔

۱۲۱۔ حضیض (نزدیک درگاہ، جائے حضور ۔ شہر و منزل ۔ ضد سفر

۱۲۲۔ ثابت پلمار ایک جگہ پر قائم رہنے والا ۔ ثابت وہ ستارہ جو حرکت نہیں کرتا۔ جمع ثوابت سیار (سیر کرنے والا) وہ ستارہ جو خورشید کے گرد گھومتا ہے۔ جمع سیارگان سیارے خود روشن نہیں سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

۱۲۲ (الف) مال آدم ہے زمیں حق نے کہا۔ والارض وضعھا للانام (۵۵ - ۱۰)

۱۲۳۔ الارض للہ آیتِ قرآنی (۷ - ۱۲۸) زمین کا مالک خدا ہے یعنی زمین اور زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ خدا کا ہے اور خدا کے تمام بندوں کا اس پر یکساں حق ہے ۔ انسان صرف امانت دار ہے ۔ مومن کا یہی تصور زندگی ہے ۔ وہ دنیا اور دنیا کی چیزوں سے دل نہیں لگاتا۔ اگر یہ تصور عام ہو جائے تو دنیا سے سارے فتنے اور فساد ختم نہ ہو جائیں۔

۱۲۳ الف ۔ آذر ۔ کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں ۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام بھی آذر تھا (۶ - ۷۴) جو بت تراش تھے ۔ آذری بت تراشی

۱۲۳ ب ۔ حکمت خیرِ کثیر ہے ۔ قرآنی آیت کی طرف اشارہ ہے ۔ ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا (۲ - ۲۶۹) یہ شعر پیامِ مشرق میں بھی ہے ۔ علامہ نے حکمت سے مراد علوم عقلی لیے ہیں۔

۱۲۴۔ اس کو بہتر ہے مسلماں تم کرو ۔ اس حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ کہ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے ساتھ ایک شیطان ہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا کہ کیا آپؐ کے ساتھ بھی ؟ فرمایا ہاں میں نے اسے مسلمان کرلیا ہے۔

۱۲۵۔ بولہب ۔ حضرت رسولؐ پاک کا چچا ۔ آپؐ کا سخت دشمن تھا جس کا ذکر قرآن کی سورۃ تَبَّتْ میں ہے۔ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ

۱۲۶۔ اپنی شبنم

شبنم سے کنایہ شعائرِ اسلامی اور یم سے کنایہ ارکان و اصولِ اسلامی

۱۲۷۔ یدِ بیضہ سفید یا روشن ہاتھ (ید۔ ہاتھ ۔ بیضہ سفید) حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ آگ میں جل گیا تھا۔ خدا نے اس کے بدلے انہیں یہ معجزہ عطا کیا کہ جب بھی آپؑ اپنی بغل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تو وہ سورج کی طرح روشن نظر آتا مجازاً مراد ہے کرامت اور معجزہ

۱۲۸ كُلَّ يَوْمٍ ۔ قرآن کی آیت کی طرف اشارہ ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۲۹ ۔ ۵۵)

۱۲۹ دینِ اسلام اس جہاں میں ہے غریب

اس حدیثِ رسولؐ کی طرف اشارہ ہے

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا فَطُوبَىٰ لِلْغُرَبَاءِ

(اسلام کی ابتدا بے کسی اور پردیس کی مصیبتوں میں ہوئی اور قریب ہے کہ ایسی ہی حالت پھر طاری ہو جائے کیا ہی خوشی ہے پردیسیوں کے لیے) عربی میں غریب مسافر کو کہتے ہیں ۔ شاید اس حدیث کی طرف اشارہ کر کے علامہ نے اس حقیقت کی طرف کا اظہار کیا ہے کہ اسلام جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل سے بالاتر ہے۔

۱۳۰۔ لات ۔ مشہور بت جو اسلام سے پہلے کعبہ میں رکھا ہوا تھا۔

۱۳۱۔ لا سے الّا کی طرف اب کر خرام لا کلمہ طیبہ کا پہلا حرف جس کے معنی ہیں "نہیں" یعنی نفی

ذات غیر الٰہی إِلّا اللہ کا اقرار کرنا۔ اسلام تمام معبودوں کی نفی کرتا ہے۔ یہ معبود صرف
لکڑی، پتھر یا کسی اور چیز کے بنے ہوئے بت ہی نہیں بلکہ وہ تصورات بھی ہیں جنہیں بیکن Bacon
نے بت کا لقب دیا ہے یا جنہیں قرآن پاک نے خواہشات کے بت کہا ہے۔ وطن، رنگ، نسل اور زبان بھی تصورات
بن کر آخر کار معبود بن جاتے ہیں۔ شعورِ انسانی مادی بتوں کے عقیدوں سے آزاد ہو
سکتا ہے لیکن یہ غیر مرئی معبود ذہن کے نہاں خانے میں اس طرح چھپ کر بیٹھ جاتے

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ

ہیں کہ ان کی نفی کرنا تو در کنار ان کے وجود کا پتا لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔
قرآن حکیم ان تمام معبودوں کی نفی کرتا ہے ـــــ اللہ کا اقرار در اصل غیر اللہ
کی نفی اور اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات کی پابندی کا اظہار و عزم ہے۔

۱۳۱۔ الفقرہ ۲۵ لاقیصر وکسریٰ ـــــ حدیث رسول پاکؐ

اذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ واذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعد
یہی مضمون "مثنوی" "پس چہ باید کرد" میں بھی ص ۱۵ پر ہے۔

ای ورود شت تو باقی تا ابد
نعرۂ لا قیصر و کسریٰ کہ زد؟

۱۳۲۔ فقر ـــــ امام راغب نے فقر کے چار معنی بتائے ہیں۔ ۱۔ حاجات ضروریہ کا پایا جانا
ہر وقت انسان ہوا، روشنی، پانی وغیرہ کا محتاج ہے۔ ۲۔ سامان معیشت کا نہ ہونا
۳۔ فقر النفس طبیعت میں حرص و طمع کا ہونا۔ ہر وقت کسی نہ کسی چیز کی احتیاج محسوس
کرنا۔ کاد الفقر ان یکون کفراً (حدیث) اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ۴۔ الفقر
الی اللہ۔ نفس کا اللہ کے فضل و کرم کا محتاج ہونا۔ الفقر فخری (حدیث)
اللھم اغنبی بالافتقار الیک ولا تفقرنی بالاستغناء منک (حدیث)
یا اللہ مجھے اپنا محتاج بنا کر غنی یعنی دنیا سے بے نیاز کر دے اور اپنے سے مستغنی کر

کے مجھے محتاج مت بنا۔ ان دونوں احادیث میں فقر کا یہی مفہوم ہے۔

علامہ نے شروع میں اپنے کلام میں لفظ فقر بمعنی مفلسی استعمال کیا ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

بعد میں علامہ کے ہاں فقر کے معنی افلاس و تنگ دستی نہیں رہے بلکہ فقر کے معنی زندگی کو غیر ضروری اور غیر متعلق اشیاء سے منقطع کرنے کا نام ہو گئے۔ علامہ کی نظر میں فقر رہبانیت یا ترکِ دنیا نہیں بلکہ اپنے استغنا سے ان چیزوں کو رد کر دینا ہے۔ فقر درحقیقت اشیا سے بے نیازی کا نام ہے۔ فقر سے مراد عشق و ایمان و یقین بھی ہے اور فقیر سے مراد انسانِ کامل، مومن، قلندر اور درویش بھی۔

علامہ اقبال کی نظر میں شاہین میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں شاہین خود دار ہے، غیرت مند ہے، کسی کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا، بلند پرواز ہے، خلوت پسند اور تیز نگاہ ہے۔

فقیر کا شکار کائنات ہے اس کا مقصود تسخیرِ فطرت ہے۔

فقرِ مومن چیست تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ او مولا صفات
فقرِ قرآن احتسابِ ہست و بود — نی رباب و مستی و رقص و سرود

فقیر خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا وہ شاہانِ وقت کو تسلیم نہیں کرتا ان کے سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ فقیر کے بوریے کے جلال سے تختِ شاہی کانپ جاتا ہے۔

قلبِ او را قوت از جذب و سلوک — پیشِ سلطان نعرۂ او لا ملوک
با سلاطین در فتد مردِ فقیر — از شکوہِ بوریا لرزد سریر

فقیر پاک دل و پاک نظر ہوتا ہے اور سکون سے نفرت کرتا ہے اور ہمیشہ زندگی کی جدوجہد میں شامل اور مخالف قوتوں سے نبرد آزما رہتا ہے۔

علم کا مقصود پاکی عقل و خرد　　فقر کا مقصود عفتِ قلب و نگاہ

سکون پرستیِ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

علامہ کی نظر میں فقر مقامِ نظر ہے اور علم مقامِ خبر ہے۔ فقر سے مراد ذوق و شوق و تسلیم و رضا، سوز و آرزو اور تمنائے شہادت ہے اور یہ وہ صفات ہیں جو ہمیں رسول پاک سے ورثے میں ملی ہیں۔

فقرِ کافر خلوت و دشت و دراست　　فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است
فقر ذوق و شوق تسلیم و رضاست　　ما امینیم این متاعِ مصطفی است
فقر سوز و درد و داغِ آرزوست　　فقر را در خون تپیدن آبروست
فقر دشاہی وارداتِ مصطفیٰ ست　　آن تجلی ہائی ذاتِ مصطفی است
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم　　علم ہے جویای راہ، فقر ہے دانای راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر　　فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

جاوید نامہ میں علامہ نے فقر اپنے عام معنوں میں بھی استعمال کیا ہے اور خاص معنوں میں بھی۔ حکیم مریخی کہتا ہے کہ دنیا میں فقر و غربت کی وجہ یہ ہے کہ ہم خدا کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو اپنا مال سمجھ لیتے ہیں ؎

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست　　آنچہ از مولاست می گوئی تراست

جاوید نامہ ہی میں علامہ شاہ ہمدان سے کہتے ہیں کہ ہم غریب ہیں اور حکمران ہم سے خراج مانگتا ہے حکومت کرنے کا حقیقی معیار کیا ہے۔

ما فقیر و حکمران خواہد خراج　　چیست اصلِ اعتبارِ تخت و تاج

علامہ "خطاب بہ جاوید" میں فرماتے ہیں کہ قہر و رضا میں انصاف کو اور امیری و فقیری میں میانہ روی کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔

عدل در قہر و رضا از کف مدہ　　قصد در فقر و غنا از کف مدہ

جاوید نامہ میں علامہ نے فقر اپنے خاص معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مرد فقیر آگ ہے جس کے سامنے سلطنت و بادشاہت گھاس پھوس ہے۔

مرد فقیر آتش است　　　میری و قیصری خس است

علامہ "روح ہندوستان فریاد کرتی ہے" کے عنوان سے فرماتے ہیں کہ اس فقر سے دور رہو جو غربت و افلاس عطا کرے۔ اس فقر کو حاصل کرو جو بادشاہت عطا کرتی ہے ؂

بگذر از فقری کہ عریانی دھد　　　ای خنک فقری کہ سلطانی دھد

ایک اور مقام پر "ارض ملک خدا است" کے عنوان سے فرماتے ہیں فقر بھوک و ننگ کا نام نہیں، فقر تو بادشاہت ہے یہ ترک و تباہی نہیں ہے ؂

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست　　　فقر سلطانی است رہبانی کجاست

علامہ "خطاب بہ جاوید" میں اپنے صاحبزادے کو نصیحت کرتے ہیں کہ خواہ تم بڑے زمیندار ہی کیوں نہ بن جاؤ لیکن ہرگز فقر کو نہ چھوڑنا یہ تمہارے بزرگوں اور اجداد کا سرمایہ ہے

گرچہ باشی از خداوندانِ دہ　　　فقر را از کف مدہ از کف مدہ

سوز او خوابیدہ در جانِ تو ہست　　　این کہن مے از نیاگانِ تو ہست

تصورِ خودی اور تصورِ عشق کے بعد علامہ اقبال نے تصور فقر کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

۱۳۳ ذکر ـــــ یاد۔ اللہ کی یاد۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ (۳-۱۹۱) وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (۲-۱۵۲)

تصوف میں ذکر کی چند قسمیں ہیں (۱) ذکرِ لسانی۔ زبان سے محبوب کا ذکر کرنا جسے ذکرِ ناسوتی بھی کہتے ہیں (۲) ذکرِ قلبی۔ محبوب کی یاد یا اس کا تصور دل میں کرنا جسے ذکرِ ملکوتی بھی

کہتے ہیں۔۳۔ ذکرِ نفسی تصورِ عقلی سے مقصودِ اصلی کی تلاش۔ اسے فکر بھی کہتے ہیں۔
۴۔ ذکرِ روحی۔ حق کا بجہت اسماء و صفات مشاہدہ کرنا۔ اسے ذکرِ جبروتی یا مشاہدہ بھی
کہتے ہیں۔ ۵۔ ذکرِ عملی، محبوب کے احکامات پر پورے خلوصِ دل سے عمل کرنا۔

قرآن میں ذکر کے معنی ہیں

۱۔ نصیحت — اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى (۳۹۔۶۹)

۲۔ محبت — فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ (۱۵۲۔۲)

۳۔ سمجھنا — وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (۵۴۔۱۷)

۴۔ اطاعت — وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ (۲۰۔۱۲۴)

فکر —— قرآن میں ہے۔ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۔۱۹۰)

رومی نے بھی دفترِ ششم میں ذکر و فکر پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

این قدر گفتیم باقی فکر کن — فکر اگر جامد بود رو ذکر کن

ذکر آرد فکر را در اہتزاز — ذکر را خورشیدِ این افسردہ ساز

۱۳۴۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا۔ آیت قرآنی۔ چوتھے سپارے کا آغاز اسی آیت
سے ہے۔ آیت ۹۲ سورہ ۳

۱۳۵۔ غیرِ حق ہر شے ہے ہالک بالیقین
کُلُّ شَیْءٍ ھَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ آیت قرآنی ۸۸ سورت ۲۸

۱۳۶۔ شہران کے دخل سے خوار و زبوں
آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْھَا (۲۷۔۳۴)

۱۳۷۔ کنفسِ واحدہ —— مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱۔۲۸)

۱۳۸۔ نقشِ کاہن دیا پا۔ اسلام نے پیشوائیت کو یکسر مٹا دیا۔ اسلام سے پہلے مذہبی طبقہ
بڑی زبردست طاقت رکھتا تھا۔ عیسائیوں میں پادری، ہندوؤں میں برہمن یا پنڈت و

پرو ہت اور آتش پرستوں میں موبد ہوتے تھے۔ ان کی طاقت بادشاہوں سے کم نہیں ہوتی تھی۔

۱۳۹۔ سربکف رہ۔ اس آیت کی طرف اشارہ ہے

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ (۹-۱۱۲)

۱۴۰۔ بخش دے جو کچھ ہے حاجت کے سوا۔ اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲۱۹-۲)

۱۴۱۔ "اپنی محفل میں" ۔ محفل سے مراد امتِ اسلامیہ ۔ مے سے مراد غیرتِ اسلامی ساقی سے مراد بالبصیرت اور پرجوش قیادت

۱۴۲۔ فتراک ۔ وہ تسمہ جو زین کے ساتھ لٹکا رہتا ہے جس میں شکار باندھا جاتا ہے۔

۱۴۳۔ ناقہ اپنا خستہ اور محمل گراں (عرفی کے اس شعر سے ملتا جلتا مضمون ہے)

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

۱۴۴۔ عقیم۔ بفتح عین ۔ بانجھ عورت ۔ بنجر

۱۴۵۔ زہرہ ۔ دیکھئے توضیح ۵۸۔

۱۴۶۔ نُوْدِ مَازَاغَ الْبَصَرُ ۔ قرآنی آیت کی طرف اشارہ ہے

(مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی) (آیت ۱۷، سورۃ ۵۳)

۱۴۷۔ بعل ـــــ لغوی معنی مالک یا امیر کے ہیں۔ قدیم سورج دیوتا کا نام جس کی پرستش قدیم اسیری، مکرانی اور فونیشی کرتے تھے۔ اس کی دوسری شکل شموس دیوتا ہے یہ بھی سورج (شمس) دیوتا ہے۔ ہندوستان میں اسے شیلوجی مہاراج کہتے ہیں جو ہندو علم الاصنام میں پیدائش کا دیوتا ہے، ویسے بھی سورج ہی سے نباتات پھلتی پھولتی

ہیں اس لیے بعل کو تمام دیوتاؤں کا سردار بنایا گیا ہے ۔ بعلبک شہر اسی کے نام پر ہے

یعوق ۔ ایک بت کا نام ۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے بتوں میں سے ایک بت کا نام
نسر ایک بت تھا جو گھوڑے کی شکل کا تھا (فرہنگِ آنندراج) ۱۰ ۔

نوح علیہ السلام کی قوم کا ایک بت ۔ دو ستارے ۔ ایک نسرِ واقع اور ایک نسرِ طائر
نسر غسر اور رمن (بت) فرضی نام ہیں ۔

لات[1] قرآن پاک میں بھی اس بت کا ذکر ہے (آیت ۱۹ سورہ ۵۳) طائف میں قبیلہ ثقیف اس کا پجاری تھا ۔ اسے سورج کی دیوی سمجھا جاتا تھا یہ طائف کا بت تھا اور اس کی صورت سنگِ چہارگوشہ کی تھی ۔ اسلام سے قبل عرب کے قبائل میں اس کی بزرگی و عظمت "عزیٰ" کے برابر تھی ۔ جنگِ احد میں ابو سفیان بطور تبرک لات و عزیٰ کے بت اپنے ساتھ لایا تھا ۔ جب قبیلہ ثقیف اسلام لے آیا تو آنحضرت ؐ نے حضرت ابو سفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ کو اس بت کے انہدام کرنے اور اس کی جگہ مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا

منات[2] ۔ اس کا بھی قرآن پاک میں نام آیا ہے (آیت ۲۰ ۔ سورہ ۵۳)
یہ بت قبائل ہذیل وخزاعہ سے متعلق تھا ۔ یہ بت بابل سے آیا تھا اور اس کا اصلی نام بابلی زبان میں "مامناتو" تھا ۔ اسے تقدیر کی دیوی کہتے تھے ۔ بقول ڈاکٹر محمد معین کا فرانسیسی بت کو چرا کر ہندوستان لے گئے اور وہاں ایک بت خانہ بنایا جس کا نام سومنات رکھا سلطان محمود غزنوی نے اس بت خانہ کو برباد کیا ۔ ویسے سومنات اصل میں سومناتھ ہے سوم ۔ چاند ناتھ ۔ خداوند ۔ یعنی چاند دیوتا ۔ عرب کے قبائل دورِ جاہلیت میں لات و منات اور عزیٰ کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے ۔ قرآن پاک میں اس بت کا ذکر ہے ۔

---

۱ ۔ فرہنگِ معین ص ۲۳ ۔ ۲۰

۲ ۔ ایضاً The Encyclopaedia of Islam by Houstma and others

عسر (بالفتح ۔ اونٹنی کا دوڑتے وقت دُم اٹھانا۔ مصریوں کا دیوتا

مرودخ ۔ بابل کا سب سے بڑا بت ۔ بادشاہ اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ کر بادشاہت کا اعلان کرتا تھا

A History of Per sia by Sykes

۱۴۸۔ ملکۂ وصل ۔ وصال کا دیوتا ۔ شاید عشق و محبت کی دیوی کی طرف اشارہ ہے ۔

ربِ فراق ۔ فراق کا دیوتا ۔ شاید اس بت کی طرف اشارہ ہے جسے صدرالدین ذات الوداع کا نام دیتے ہیں ۔ (قصص القرآن ۔ صدرالدین بلاغی)

زوج مشتری ۔ رب الارباب ۔ وہ مشہور بت جسے بابلی بعل، یونانی زیوس اور رومی جوپیٹر کہتے تھے ۔

۱۴۹ ۔ اَلَستُ ۔ قرآنی آیت ۔ اَلَستُ بِرَبِّکُم قَالُو بَلیٰ (آیت ۱۷۲، سورۃ ۷) روزِ ازل اللہ تعالیٰ نے مخلوقات سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا ۔ بیشک کیوں نہیں ۔

۱۵۰ ۔ یزداں ۔ خدا ۔ اصل میں ایزد کی جمع تھا ۔ اب واحد کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ خود لفظ ایزد، ایز (Yaz) سے بنا ہے جس کے معنی پوجنا تعریف کرنا ہیں ۔

دیو ۔ وہ خیالی یا افسانوی وجود جو ہے تو انسان کی طرح لیکن بے حد طویل القامت اور قوی جثہ اور دہشت ناک جس کے سینگ بھی ہوتے ہیں اور دُم بھی ۔ اصل میں یہ لفظ آریائی ہے جو روشنی، فروغ اور خدائے بزرگ کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا ۔ ایران میں جب زرتشت مذہب پھیلا اور اس نے خدائے یگانہ کا نام اہورا مزدا بتایا تو دیو سے مراد گمراہ کرنے والا اور شیطان کا دوست ہو گئے ۔

۱۵۱ ۔ کچنر ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا ۔ ۱۸۸۵ء میں جنرل گارڈن کی امداد کے لیے سوڈان بھیجا گیا اس کے پہنچنے سے پہلے ہی مجاہدین نے خرطوم فتح کر لیا تھا اس نے ۱۸۹۸ء میں خرطوم

فتح کیا۔ ۱۹۰۲ء میں ہندوستانی افواج کا سپہ سالار بنایا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں فیلڈ مارشل کا عہدہ ملا۔ ۱۹۱۶ء میں ہمپ شائر جہاز کے غرقاب ہونے کی وجہ سے واصل جہنم ہوا۔

۱۵۲۔ چوب کلیم۔ عصائے موسیٰؑ

۱۵۳۔ دونوں ہی دریا کے اندر تشنہ میر

فرعون اور کچنر دونوں کی موت سمندر میں ڈوب کر ہوئی تھی۔

۱۵۴۔ سورۃ طٰہٰ۔ یہ سورۃ اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس میں نورِ خدا کا ذکر ہے۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضُ۔ الخ

۱۵۵۔ خود کا استحکام اور ترک نفاق۔ انگریز کی پالیسی Divide and Rule کی طرف اشارہ ہے۔

۱۵۶۔ زُجاج۔ شیشہ

۱۵۷۔ ذو الخرطوم (۱) سونڈ والا (ذو۔ والا۔ خرطوم۔ سونڈ) (۲) خرطوم سوڈان کا دارالحکومت جسے کچنر نے فتح کیا اس حکومتِ برطانیہ نے لارڈ کچنر کو لارڈ آف خرطوم کا خطاب دیا تھا۔ ذو الخرطوم اس کا عربی ترجمہ ہے۔

۱۵۸۔ درویش سوڈانی۔ یعنی مہدی سوڈانی۔ مہدی کا نام محمد احمد بن عبداللہ تھا۔ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ سوڈان کے مشہور شیخ طریقت شیخ محمد شریف سے بیعت کی۔

۱۸۸۳ء میں علمِ جہاد بلند کیا۔ ۱۸۸۵ء میں وفات پائی۔ ۱۸۹۸ء میں کچنر نے خرطوم فتح کیا اور سب سے پہلے یہ کام کیا کہ مہدی کی قبر کھدوائی اور اس مردِ مومن کی ہڈیاں سرِ بازار نذرِ آتش کیں۔

۱۵۹۔ فواد۔ ۱۹۳۶ء۔ ۱۸۶۸ء مصر کا حکمران جو اپنے بھائی کے بعد ۱۹۱۷ء میں تخت کا وارث بنا۔ ۱۹۲۲ء میں جب مصر آزاد ہوا تو اس کا پہلا بادشاہ بنا۔

۱۶۰۔ فیصل۔ فیصل بن شریف حسین (۱۹۳۳ء۔ ۱۸۸۳ء) پہلی جنگِ عظیم کے بعد خلافت

عثمانیہ کی تقسیم کے بعد عراق میں شورشیں برپا ہوئیں جس کی قیادت امیر فیصل کر رہے تھے۔ آخر ۱۹۲۱ء میں امیر فیصل اول کے نام سے عراق میں تخت نشین ہوئے۔

۱۶۱۔ ابنِ سعود۔ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن بن فیصل (پیدائش ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء۔ وفات ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۳ء) کویت کے شیخ کی مدد سے ۱۹۰۲ء میں حکومت کا تختہ الٹ کر ریاض پر قبضہ کر لیا۔ ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو اس کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا ۲۰ مئی ۱۹۲۷ء کو اس کے اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے برطانیہ نے مملکت نجد و حجاز کی مکمل آزادی کو تسلیم کر لیا۔ ابن سعود نے ۱۹۵۳ء میں طائف میں وفات پائی۔

۱۶۲۔ بطحا بالفتح (ع) وادی مکہ معظمہ۔ لغت میں بطحا کے معنی فراخ زمین جو سیلاب کی گزرگاہ ہو اور اس میں سنگریزے پڑے ہوں۔ (فرہنگ آنند راج)

۱۶۳۔ خالد۔ حضرت خالدؓ بن ولید۔ مشہور صحابی اور اسلامی سپہ سالار

۱۶۴۔ فاروق۔ حضرت عمرؓ فاروق۔ خلیفۂ دوم

۱۶۵۔ جہانِ مومنانِ مشک فام سے مراد براعظم افریقہ

۱۶۶۔ یثرب (بفتح یا بکسر ا) ہجرت سے پہلے مدینہ کا نام

۱۶۷۔ نجد۔ یہاں مراد غیر اسلامی زندگی

۱۶۸۔ مریخ۔ بکسرِ اول۔ مشہور سیارہ۔ اسے بہرام بھی کہتے ہیں ہندی میں منگل کہتے ہیں اور انگریزی میں Mars لقب جلادِ فلک۔ آسمان پنجم۔ کیمیا گروں کی اصطلاح میں لوہا اور فولاد۔ (فرہنگ آنند راج برہانِ قاطع)

۱۶۹۔ مرو۔ بفتحِ اول بسکونِ واو۔ خراسان کے علاقے میں ایک شہر کا نام۔ برہان قاطع

۱۷۰۔ مرغدین۔ علامہ اقبال کی (مثالی) خیالی دنیا Utopia

۱۷۱۔ برخیا۔ بالفتح وخائے معجمہ۔ بظاہر فرضی نام ہے۔ ویسے برخیا حضرت زکریاؑ کے

والدکا نام بھی تھا اور حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف کے والد کا نام بھی تھا

(۱) قصص القرآن حفظ الرحمٰن (۲) Arberry فرہنگِ آنند راج۔

۱۷۲۔ فرزمرز۔ گویا شیطان ہی کا دوسرا نام ہے۔ مریخ کا شیطان

۱۷۳۔ تو یہاں ہے اور شاداں ہے عجب۔ اسی طرح آدم کو بھی شیطان نے بہکایا تھا۔

۱۷۴۔ تقدیر۔ دیکھئے توضیح اضافی ۲۸۹

۱۷۵۔ رنج و زحمت ہیں تو ہیں تقدیر سے

یعنی اگر انسان یہ سوچ لے کہ تقدیر ہی سب کچھ ہے عمل بیکار ہے تو تباہی یقینی ہے۔

۱۷۶۔ لاتُفْسِدُوْ۔ قرآنی آیت۔

لَاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۷-۵۶) کی طرف اشارہ ہے۔

ترجمہ... زمین پر اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔

۱۷۷۔ صعوہ۔ ممولا (بفتح صاد و واو) ایک چڑیا کا نام جس کی دم لمبی ہوتی ہے اور جسے اللہ میاں کی دھوبن بھی کہتے ہیں۔

۱۷۸۔ ریو۔ (بکسر را و سکون یا) مکر، حیلہ، فریب۔

۱۷۹۔ رنگ۔ مکر و حیلہ

۱۸۰۔ جَنین۔ (بفتح جیم و کسر نون) پوشیدہ چیز۔ رحم مادر میں بچہ

۱۸۱۔ اَرحام۔ جمع رحم۔ بچہ دانی

۱۸۲۔ ابرِ نیسان۔ نیسان بفتح نون۔ فصل بہار کا دوسرا مہینہ۔ ابرِ نیساں بہار کا بادل

۱۸۳۔ مشتری۔ نظام شمسی کا سب سے بڑا سیارہ۔ اسے برجیس بھی کہتے ہیں۔ ہندی میں برہسپت کہتے ہیں۔ اس کا لقب قاضی فلک ہے۔ انگریزی میں اسے ... کہتے ہیں۔ مبارک سیاروں میں شمار ہوتا ہے جس کے طالع پر مشتری اور زحل کا قِران ہو۔ اسے صاحبِ قِران کہتے ہیں۔ وہ صاحبِ اقبال ہوتا ہے۔ تیمور کا لقب صاحبقِران

تھا اور شاہجہان کا لقب صاحبقران ثانی تھا۔ فلک ششم اس سے منسوب ہے۔

۱۸۴۔ غالب۔ اردو کا مشہور شاعر

۱۸۵۔ حلّاج۔ ابوعبداللہ، ابوالمغیث حسین بن منصور حلّاج ۲۴۴ھ/۸۵۸ء کے لگ بھگ الستخر کے قریب۔ بیضا کے ایک محلہ طور تامی میں پیدا ہوا۔ حسین بن منصور کا دادا مجوسی تھا اس کا باپ پیشے کے اعتبار سے دُھنّیا تھا۔ حسین بن منصور نے بچپن میں قرآن پاک حفظ کیا۔ عالم شباب میں سہل تُستری سے بیعت کی۔ حلّاج سہل کو چھوڑ کر بیس سال کی عمر میں بصرہ پہنچا اور حسن بصری کے مدرسہ میں پڑھنے لگا۔ خانقاہ عبادان۔ (آج آبادان) میں عمرو مکی سے خرقہ تصوف پایا اور خود پیر طریقت بن گیا اس کے بعد ام الحسین بنت ابو یعقوب اقطع بصری سے شادی کی اور ساری زندگی اس عورت سے نباہی اس سے چار بچے پیدا ہوئے۔ تین بیٹے ایک بیٹی۔

۲۶ سال کی عمر میں پہلا حج کیا۔ ایک سال حرم بیت اللہ میں روزہ، سکوت اور عمرہ کا عمل جاری رکھا۔ اس خلوت و ریاضت میں ذوق باطنی نے تزکیہ پایا اور فنائے قلب حاصل ہو گیا۔ حلاج کہتا ہے۔

لَو اُلقِیَ مِمَّا فِی قَلْبِیْ ذَرَّۃٌ عَلیٰ جِبَالِ الْاَرْضِ لَذَابَتْ

اگر جو کچھ میرے دل میں ہے اس کا ایک ذرہ جہان کے پہاڑوں پر ڈال دیا جاتا تو وہ سب پگھل کر رہ جاتے۔

اس کے بعد خراسان، فارس، ترکستان، ہندوستان کی سیر و سیاحت کی پھر حج کیا۔ ۲۹۷ھ میں بغداد میں وحدۃ الوجود کی تعلیم دینا شروع کی۔ تمام صوفیا، علما، حکما، متکلمین اور محدثین نے سخت مخالفت کی۔ ۳۰۱ میں گرفتار ہوا ۹ سال تک جیل میں رہا۔ قاضی ابوعمر نے قتل کا فتویٰ دیا۔ سات ماہ تک مقدمہ چلا آخر ۳۰۹ھ/۹۲۲ء میں پہلے اعضا قطع کیے پھر مصلوب کیا اس کے بعد اس کی نعش

کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور راکھ دجلہ میں بہا دی گئی۔ کتاب الطواسین اس کی مشہور تصنیف ہے۔

ص ۲۸۔ مصائب حلاج از لوئی ماسینون جلد اول ترجمہ ڈاکٹر سید ضیاء الدین دہشیری

ص ۱۲۳ - ۱۵۴ تذکرۃ الاولیاء مرتبہ میرزا محمد خان قزوینی۔ کشف المحجوب
خاتونِ عجم ۔ قرۃ العین طاہرہ (علی اکبر)

اصل نام زرین تاج تھا۔ حاجی ملا محمد صالح کی بیٹی تھی۔ شعر گوئی اور خطابت میں کمال حاصل تھا۔ زرین تاج کے چچا ملا محمد تقی مجتہد کے بیٹے ملا محمد سے شادی ہوئی۔ باب کی دعوت قبول کی اور اس سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ سسرال والوں نے اس کی شدید مخالفت کی لیکن زرین تاج باز نہ آئی۔ سسر نے بابیوں کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ قزوین کے بابیوں نے ملا محمد تقی کو قتل کر دیا۔ باب نے اسے قرۃ العین کا خطاب دیا۔

۱۸۵۲ء میں باب کو ناصر الدین شاہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ ۱۸۵۲ء میں طاہرہ بھی گرفتار ہوئی۔ جب اس کو شاہ کے حضور میں پیش کیا گیا تو وہ اس کے حسن و جمال سے بیحد متاثر ہوا۔ اس نے علما سے کہا۔

بگزارید کہ صورتِ زیبا دارد

نوائے طاہرہ کے عنوان سے اس کی جو غزل علامہ نے جاوید نامہ میں پیش کی ہے وہ ۵ شاعروں اور شاعرات سے منسوب ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ حزین لاہیجی ۲۔ ملا محمد باقر صحبت لاری ۳۔ طاہر کاشانی
۴۔ طاہرہ اصفہانی ۵۔ طاہرہ قرۃ العین

محققین کا خیال ہے کہ یہ غزل طاہر کاشانی کی ہے جو عہدِ صفویہ کا شاعر ہے۔

ص ۳۳۳۔۳۴۔ اشعار جاویدان پارسی از امیر مسعود سپہرم۔ چاپ اول تھران ۱۳۳۹ھ خورشیدی۔ زبان سخنور از علی اکبر ص ۸۰ جلد دوم)

نیز قرۃ العین طاہرہ کی غزل میں (جو اس سے منسوب ہے) ۱۵ شعر ہیں علامہ نے ۵ شعر لیے۔ ایک شعر نہیں لیا۔ جو یہ ہے ؎

در دہانِ تنگِ تو عارضِ عنبرین خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

۱۸۷۔ سُلَیمٰی Sulaima سانِ سلیمی۔ عربوں میں سلیمی یا سلمیٰ عام معشوقہ کا نام ہے جیسے لیلیٰ اور ایران میں شیریں۔

۱۸۸۔ شحنہ۔ بکسرِ شین۔ داروغہ، تھانیدار۔ کوتوالِ شہر

۱۸۹۔ ہم بندۂ حیدر رہیں۔۔۔۔ اس واقعہ کی طرف تلمیح ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی تھی حضورؐ نے دعا کی کہ وقت عصر واپس آجائے۔ ان کی دعا قبول ہو گئی۔ علامہ نے بھی اس روایت کی طرف ایک شعر میں اشارہ کیا ہے[الف]

ہر کہ در آفاق گردد بو تراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

۱۹۰۔ یم۔ بفتح یا و تشدید میم۔ سمندر

۱۹۱۔ نخ۔ بفتح نون۔ رشتہ، دھاگہ

۱۹۲۔ پو۔ پود کا مخفف، یعنی بانا۔ وہ تار جس سے کپڑا بنتے ہیں اور بجائے لمبائی چوڑائی میں استعمال کرتے ہیں۔

۱۹۳۔ لا بہ لا۔ لا کے معنی ہیں "میں" اور "اندر" کے لا بہ لا اندر کے اندر

۱۹۴۔ علم کی بیم و رجا پر ہے اساس۔

اس حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ الایمانُ بین الخوفِ والرجاء

۱۹۵۔ یہ دلِ مجبور ہے مجبور کب

یعنی عاشق کا دل عشق کی وجہ سے مجبور تو ہوتا ہے لیکن اس کی مجبوری حاکمانہ قسم کی

الف۔ تلمیحاتِ اقبال از اکبر حسین قریشی۔ ص ۱۰۹

نہیں ہوتی ۔ عاشق کا مقصد عبادت، حور، قصور کا حصول نہیں۔

۱۹۶۔ دینِ مرد صاحبِ ہمت ہے جبر

جب آدمی یہ سوچ لے کہ جو کچھ ہوتا ہے ۔ وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے موت اور زندگی صرف خدا کے ہاتھ میں ہے تو پھر وہ بے خوف اور بے دھڑک بڑے بڑے خطرات اور معرکوں میں ثابت قدمی سے ڈٹا رہتا ہے ۔ یہ جبر ہے اور جبر بھی صاحب ہمت کا لیکن مردِ خام کا جبر آغوشِ قبر ہے یعنی موت ہے وہ تو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے کہ جو کچھ ہوگا خدا کی طرف سے تو پھر مجھے عمل کرنے کی کیا ضرورت ہوں وہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔

۱۹۷۔ (جنگ کے دن تیر اس کا تبر حق)

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (۸۔۱۷) کی طرف اشارہ ہے۔

۱۹۸۔ خودی ۔ دیکھئے نوٹ ضمیمہ نمبر ۲۸۳

۱۹۹۔ ارژنگ ۔ ارژنگ ۔ ارونگ سے مانی نے انجیل کو یا تصویر لکھا تھا اسے ارونگ یا ارژنگ کہتے تھے۔

۲۰۰۔ زندگانی کا ہے ہنگامہ جہاں

یہ تلمیح اس مناظرہ کی طرف ہے جو ۱۸۷۰ء میں حضرت مولانا فضل الحق خیر آبادی مرحوم اور حضرت مولانا اسماعیل شہید کے درمیان ہوا کہ خدا آنحضرت خاتم النبیینؐ کی نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے کہ نہیں۔ حضرت مولانا فضلِ حق کا عقیدہ یہ تھا کہ آنحضرتؐ کا نظیر ممتنع الوجود ہے اور حضرت اسماعیل شہید کا دعویٰ یہ تھا کہ اگرچہ خداوند تعالیٰ آنحضرتؐ کا نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے لیکن پیدا نہیں کرے گا کیونکہ آپؐ خاتم النبیین ہیں غالب چونکہ مولانا فضل حق کے دوست تھے اس لیے ان کی فرمائش پر ان کی تائید میں ایک مثنوی لکھی ۔ مگر مولانا کے عقیدہ کی تائید کے بجائے یہ لکھ دیا کہ

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ اللعالمینی ہم بود

جب مولانا نے غالب سے کہا کہ تم نے میرے عقیدے کی تردید کر دی تو غالب نے یہ دو شعر بڑھا دیئے ؎

منشاء ایجاد ہر عالم یکی ست گر دو صد عالم بود خاتم یکی ست

جوہر کل بر نتابد ثانیہ در محمدؐ رہ نیابد ثانیہ

۲۰۱۔ خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا

آیت قرآنی۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی، الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی (آیت ۳، سورۃ ۸۷)

۲۰۲۔ عبدہٗ (تعین اول ہے۔ تعین اول کو وحدت بھی کہتے ہیں اور حقیقتِ محمدی بھی۔ حقیقتِ محمد رب ہے اور ذات محمدی عبدہٗ ہے) عبدہٗ کا کلمہ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے یہاں سورہ اسرا کی پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے اس کے معنی ہیں "اس کا بندہ"۔ یعنی خدا کا بندہ۔ صوفیا نے اس لفظ سے ایک خاص معنی مراد لیے ہیں۔ صوفیاء کے نظریۂ تخلیقِ کائنات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مختلف مراتب میں نزول فرمایا ہے۔ سب سے پہلا مرتبۂ نزول تعینِ اول یا عبدہٗ ہے جسے وحدت بھی کہتے ہیں اور حقیقت محمدی بھی۔ ان کے خیال میں حقیقت محمد رب ہے اور ذات محمدی عبدہٗ ہے۔ اسی لیے علامہ نے ھو عبدہٗ کہا ہے

ع صاف گویم تو بگو ہو عبدہٗ

(تفصیل کے لیے دیکھئے توضیح نمبر ۱ (سر دلبران) از ذوقی)

۲۰۳۔ مَارَمَیْتَ۔ آیتِ قرآنی۔ وَمَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸۔۱۷)

۲۰۴۔ سکر۔ تصوف میں کسی قوی کیفیت کے وارد ہو جانے کی وجہ سے احساس سے غائب ہو نا سکر ہے۔ احساس کی طرف لوٹ آنے کا نام صحو ہے۔

ع خود کو بہتر جس نے آدم سے کہا

اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ (۷-۱۲)

۲۰۶۔ خواجۂ اہل فراق۔ (ابلیس کا جوشِ عمل خودی کا اظہار اور تقلید سے بیزاری حضرت اقبال کو خود بھی پسند ہیں) حلاج بھی بیگانۂ ذوقِ وصال ہے۔ علامہ بھی فراق کو وصال پر ترجیح دیتے ہیں اس لیے ابلیس کا ذکر حلاج کے ساتھ ہوا ہے کہ دونوں میں ایک معنوی ربط ہے۔

۲۰۷۔ اباق۔ پیالہ

۲۰۸ ع عشق اور خدمت میں ہے وہ کہتر تر۔

عشقِ ابلیس سے مراد ابلیس کی وہ صفت ہے کہ بس گویا وہ خدا ہی کو سجدہ کرنا چاہتا تھا اور انسان کو رقیب جانتا تھا۔

۲۰۹۔ یعنی اگر میں انکار نہ کرتا تو دنیا میں بدی نہ ہوتی اور پھر انسان کو نیکی اور بدی میں کسی ایک کو اختیار کرنے کی طاقت نہ ملتی۔

۲۱۰۔ ابغض الاشیاء عندی الطلاق۔ حدیث نبویؐ ہے (میرے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے

(ابغض الحلال الی اللہ الطلاق۔ کنوز الحقائق ص۲

ما احل اللہ شیاء ابغض الیہ من الطلاق۔ مستدرک حاکم نمبر۱ ص ۱۹۶

احادیث مثنوی ص ۵۸ از فروزانفر

۲۱۱۔ ابا۔ انکار

۲۱۲۔ زحل۔ بضم ز ا۔ وفتحِ حا۔ مشتری کے بعد سب سے بڑا سیارہ۔ اسے کیوان بھی کہتے ہیں۔ ہندی میں سنیچر نام ہے۔ اس کے گرد حلقۂ نور ہے اس لیے اسے عالم

زنّار بوش کہا ہے۔ اس کے نام ادب میں پاسبانِ فلک، ہندو نے فلک بھی ہیں
فلک ہفتم اس سے منسوب ہے۔ انگریزی میں اسے Saturn کہتے ہیں۔

۲۱۳۔ مطرود۔ رد کردہ۔ راندہ شدہ

۲۱۴۔ طاغوت۔ سرکش۔ ماسوائے خدا ہر معبود۔ معبود باطل جمع طواغیت

۲۱۵۔ جعفر و صادق۔ آگے دیکھئے ۲۲۲

۲۱۶۔ قلزم۔ بضم قاف و زا۔ بحرۂ احمر کا نام نیز سمندر

۲۱۷۔ ماضیِ مرحوم پہ اس کی نظر — مراد مسلمانانِ ہند

۲۱۸۔ جابر و مجبور کو ہے زہر جبر۔ یہاں صابر ہونا چاہیئے یعنی
صابر و مجبور کو ہے زہر جبر (واللہ اعلم)

۲۱۹۔ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ (آیت قرآنی آیت ۲۶ سورہ ۳۶ یٰسین)

۲۲۰۔ عنتری۔ عنترہ سے۔ عنترہ کے لغوی معنی "شجاع اور بہادر" کے ہیں۔ اسلام سے
پہلے اس نام کے کئی عرب شاعر اور جنگجو بہادر ہوئے ہیں لیکن مشہور عنترہ بن شداد
ہے جو چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ عرب تھا ماں حبشی کنیز تھی۔
عنترہ کی شخصیت کے ساتھ بہت سی روایات وابستہ ہیں ان میں عنترہ کو زمانہ جاہلیت
کے عرب شہسوار کی حیثیت سے ایک ہیرو کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ قبیلۂ طے کے
ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔
عنترہ عربی کا ایک عظیم شاعر بھی تھا جس کے قصائد بہت مشہور ہیں۔

۲۲۱۔ ھدم۔ بفتحِ ہا بسکونِ دال۔ برباد کرنا۔ منہدم کرنا۔ ویران کرنا۔

۲۲۲۔ جعفر۔ نام جعفر علی خان لیکن تاریخ میں میر جعفر کے نام سے مشہور ہے۔ نواب سراج الدولہ
کا وزیر تھا۔ میر جعفر نے بنگال کے نواب سراج الدولہ سے غداری کی انگریزوں سے
مل گیا۔ نواب کو انگریزوں سے شکست ہوئی اور یوں بنگال میں اسلامی حکومت کا خاتمہ

ہوا۔ ۱۷۶۵ء میں انتقال ہوا۔

میر صادق، حیدر علی سلطان میسور کا وزیر تھا۔ مذہباً شیعہ تھا۔ والی میسور ٹیپو سلطان شہید سے غداری کی انگریزوں سے مل گیا۔ سرنگاپٹم کے محاصرے کے آخری دن یعنی ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جب سلطان ڈڈی دروازے سے باہر نکلا تو میر صادق نے اندر سے دروازے کو بند کرادیا تاکہ سلطان اندر نہ آسکے۔ ٹیپو سلطان شہید ہوگئے اور میسور کی اسلامی سلطنت ختم ہوگئی۔

۲۲۳۔ نطشے۔ فریڈیرک نطشے

۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ باپ پادری تھا۔ بچپن میں یتیم ہوگیا۔ علم اللغت اس کا خاص مضمون تھا۔ ۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس کی جنگ میں شرکت کی لیکن صحت کی خرابی کی بنا پر واپس آگیا۔ تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۷۹ء میں استعفیٰ دے دیا۔ آمدنی قلیل خیالات باغیانہ، مزاج نازک، طبیعت شاہانہ، غمگسار ناپید اور اس پر طرہ یہ کہ تجرد کی زندگی۔ ۱۸۸۹ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ اختلال دماغ کا عارضہ تادم وفات قائم رہا۔ ۱۹۰۰ء میں وفات پائی اس نے مسیحیت پر کڑی تنقید کی۔ اس لیے کلیسائی اس کے شدید مخالف ہوگئے خدا کا منکر تھا اس لیے مذہبی طبقہ بھی مخالف ہوگیا۔ مغربی تہذیب پر تیز و تند حملے کیے اس لیے تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کے خلاف ہوگیا۔ نطشے فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا اور موسیقی سے تو اسے عشق تھا اس کا قول ہے کہ موسیقی کے بغیر زندگی ایک غلطی ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کا باپ پادری تھا آبائی مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا۔ گویا بقول غالب کہ

ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

وہ نہایت ذہین و فطین، دقیقہ رس اور نکتہ دان تھا یہ اسی کا قول ہے کہ "انسان ہی وہ حیوان ہے جو ہنس سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رونا بھی وہی جانتا ہے۔"

۲۲۴۔ حلاج بے دار و رسن

نطشے بھی حلاج کی طرح خودی کو عینِ خدا کہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ نطشے نے خدا کے بجائے فوق البشر کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۲۲۵۔ راہرو محرم رہبر ہی رہا

نطشے کا قول ہے کہ "میں اکیلا ہوں، تنہا ایک اہم مسئلہ حیات سے دوچار ہوں میں ایک دشت میں گم گشتہ ہوں۔ مجھے معتقدوں کی ضرورت ہے اور ہاں مجھے مرشد کی بھی ضرورت ہے۔ کوئی مرشدِ حقیقی مل جائے تو اس کی اطاعت کیا۔ حسرت آفریں ہے مجھے زندہ انسانوں میں کیوں کوئی ایسا صاحبِ بصیرت نہیں ملا۔ شاید میری سعی و طلب میں خلل تھا۔ (خطباتِ اقبال ص ۔)

۲۲۶۔ شیخ احمد۔ حضرت مجدد الف ثانی ۔ شیخ احمد نام لقب بدرالدین، کنیت ابوالبرکات ۹۷۱ھ/ ۱۵۶۴ء میں بروز جمعہ بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ مخدوم عبدالاحد ایک عالم اور ولی اللہ تھے۔ حضرت مجدد معقولات و منقولات کی تحصیل سے فراغت کے بعد آگرہ گئے۔ وہاں ابوالفضل اور فیضی سے ملاقات ہوئی لیکن ان دونوں بھائیوں کی مذہب کے معاملہ میں حد سے بڑھی ہوئی آزاد خیالی سے بہت بیزار ہوئے اور یہ کہہ کر "اَلْحُبُّ لِلّٰہِ اَلْبُغْضُ لِلّٰہِ"۔ ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ پہلے اپنے والدِ ماجد سے بیعت کی ان کی وفات کے بعد خواجہ باقی باللہ سے بیعت کی سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کی بنیاد رکھی۔ اکبری دور میں مذہبی بحران انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انہی کی کوششوں سے اکبر کا بیٹا جہانگیر دین کی طرف مائل ہوا۔ ۱۶۲۴ء میں وفات پائی۔ کارنامے (۱) دین الٰہی کا استیصال کیا (۲) تصوف سے غیر اسلامی عناصر کو پاک کیا۔

عام خیال تھا کہ شریعت اور طریقت جداگانہ چیزیں ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا

کہ شریعت اور طریقت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نماز پڑھنا شریعت ہے۔ حضور قلب سے پڑھنا طریقت ہے۔

۲۲۷۔ کن فکان۔ قرآنی آیت۔ کُن فَیَکُون کا مخفف۔ وَاِذَا اَرَادَ شَیْئاً اَنْ یَقُوْلَ لَہُ کُنْ فَیَکُوْنُ (جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کن (ہو جا) بس وہ ہو جاتا ہے (آیت ۸۲۔ سورۃ ۳۶)

۲۲۸۔ شرف النسا۔ نواب خان بہادر خان کی بیٹی اور نواب عبدالصمد خان کی پوتی تھیں۔

۲۲۹۔ عبدالصمد۔ عبدالصمد کو جو عالمگیر کے عہد میں صاحب منصب تھا۔ ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر نے پنجاب کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس نے بندہ بیراگی کے فتنہ کا استیصال کیا جس نے پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ۱۷۳۹ء میں انتقال ہوا۔

۲۳۰۔ سید علی ہمدانی۔ ولادت ۱۳۱۴ء/۷۱۴ھ ہمدان میں اپنے ماموں علاؤ الدین سمنانی سے علوم باطنی حاصل کیے۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کی ۷۷۴ھ میں بہت سے درویشوں کے ساتھ کشمیر میں تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لائے۔ ۷۸۴ھ میں ترکستان کا قصد کیا مگر راہ میں وفات پائی۔ سید علی ہمدانی ایران سے بہت سے صناع بھی ساتھ لائے تھے جن کی بدولت آج بھی کشمیر نقاشی، قالین سازی میں مشہور زمانہ ہے۔ ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں "ذخیرۃ الملوک" بہت مشہور ہے۔

۲۳۱۔ ملا طاہر غنی کاشمیری۔ شاہجہانی عہد کا شاعر۔ کلیم اور صائب کا ہمعصر۔ پیام مشرق میں ایک نظم "غنی کاشمیری" کے عنوان سے ہے ۱۶۶۱ء/۱۰۷۲ھ میں وفات پائی۔ اس کا یہ شعر مشہور ہے۔

حسن سبزی بخط سبز مرا کرد اسیر — دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

۲۳۲۔ (غزالی۔ (۱۰۵۸م-۱۱۱۱ء/۵۰۵ھ)۔

حجۃ الاسلام محمد بن محمد بن

احمد طوسی کنیت ابوحامد اور لقب حجۃ الاسلام ۔ سلجوقی دور کا بہت بڑا عالم اور مفکر۔ فقہ، حکمت اور علم کلام میں اپنے عہد کا مشہور استاد ۔ ان کے والد بہت دیندار آدمی تھے ان کا پیشہ کپڑا بننا تھا اسی نسبت سے انہیں غزالی کہا جاتا ہے بچپن میں یتیم ہو گئے ۔ امام الحرمین ابو المعالی جوینی سے علوم متداولہ حاصل کیے ۔ امام الحرمین کی وفات تک ان کی خدمت میں رہے ۔ بعد میں نیشاپور گئے ۔ ۳۵ سال کی عمر میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس مقرر ہوئے ۔ ۴ سال کے بعد تدریس چھوڑ کر تصوف اختیار کر لیا ۔ دس سال کی سیر و سلوک کے بعد طوس واپس آ گئے ۔ مدرسہ نظامیہ نیشاپور میں تعلیم دینا شروع کی ۔ اس کے بعد طوس میں خانقاہ بنوالی اور گوشہ نشین ہو گئے ۔ عوام کی رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے ۔ فقہا نے کفر کے فتوے دیئے ۔ مشہور تصانیف ۔ کیمیائے سعادت ۔ فارسی احیاء العلوم الدین (عربی) تہافۃ الفلاسفہ ۔

۲۲۴ ۔ فسن ۔ سنگ فسن ۔ دیکھئے گزشتہ توضیح ۵۵

۲۳۴ ۔ بشنو ۔ مثنوی مولانائے روم کے پہلے شعر کی طرف اشارہ ہے ۔

بشنو از نے چوں شکایت می کند از جدائی ها حکایت می کند

جسے یوں بھی پڑھتے ہیں ۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائی ها شکایت می کند

۲۳۵ ۔ شہاب الدین ۔ کشمیر کا ایک حکمران ۔ ۱۳۵۴ء/۷۵۵ھ میں تخت نشین ہوا ۔ نہایت شجاع حوصلہ مند تھا ۔ دودھ پینے کا بہت شائق تھا ۔ اس لیے اس کا نام شیر اکشام جو بگڑ کر سیامک بن گیا اس کے عہد حکومت میں کشمیر کی سلطنت اپنے عروج پر تھی ۔ لداخ ، گلگت ، کافرستان ، چھوٹا تبت ، بلتستان ، کاشغر ، کابل ، پشاور ، سندھ اور پنجاب اس کے زیر نگین تھے ۔

اس کی وفات سے ایک سال قبل شاہ صاحب کشمیر میں آئے اس نے شاہ صاحب کا

استقبال کیا۔ ۵۵ء میں وفات پائی۔

۲۳۶۔ جینوا

جینوا میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۰ء میں مجلس اقوام قائم ہوئی۔ جس کی غایت یہ تھی کہ دنیا کے لوگوں کو جنگ وغارت گری سے بچایا جائے۔ اس مجلس کے منشور کے مطابق دو ملکوں میں اختلافات رونما ہونے کی صورت میں مجلس ثالثی کے ذریعے فیصلہ کرانے کی سعی کرے گی۔ بصورتِ دیگر حملہ آور کے خلاف مناسب اقدام کرے گی لیکن امن قائم رکھنے کے سلسلہ میں مجلسِ اقوام کی کوششیں جزوی طور پر کامیاب ہوئیں لیکن جب ہٹلر نے دوسری جنگ عظیم شروع کی تو مجلس بے بس رہی۔ آخر ۱۹۴۶ء میں مجلس ٹوٹ گئی۔ اب اس کی جگہ اقوام متحدہ نے لے لی ہے۔

۲۳۷۔ بیچی ہے ایک قوم نوا رزاں بھی کس قدر

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معاہدہ امرتسر کے تحت انگریزوں نے ۱۸۴۶ء میں پچاس لاکھ روپے کے عوض پورا کشمیر گلاب سنگھ کو بیچ دیا تھا۔

۲۳۸۔ منکم نشان ہے۔ اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

۲۳۹۔ برہمن زادگان زندہ دل۔

مراد موتی لعل نہرو اور جواہر لعل نہرو ہیں جو کشمیری پنڈت تھے۔

۲۴۰۔ بھرتری ہری۔ ساتویں صدی عیسوی کا ایک ہندو شاعر اور عالم۔ راجہ بکرماجیت کے بھائی تھے۔ انہوں نے راج چھوڑ دیا تھا نیز دیکھئے توضیح ۲۹۔

۲۴۱۔ آذری۔ ایران کے خورشیدی سال کے نویں مہینہ کا نام آذر ہے۔

۲۴۲۔ نادر شاہ افشار۔ ولادت ۱۶۸۸ء میں ہوئی اصلی نام نادر قلی تھا یعنی خدا کا غلام۔

نادر یہ تھا یعنی خدا اور قلی غلام۔ افشار قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ امام قلی

چرواہا تھا۔ نادر قلی بھی بھیڑ بکریوں کا کاروبار کرتا تھا۔ ۲۸ سال کی عمر میں ازبکوں کے ہاتھوں اسیر ہو گیا۔ چار سال بعد قید سے بھاگ کر ابیورد کے حکمران بابا علی بیگ کی خدمت میں پہنچا۔ مقام و مرتبہ پایا۔ آہستہ آہستہ شاہ طہماسپ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ بہت سی جنگوں میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ سپہ سالار بنا دیا گیا ۱۷۴۸ء میں خود بادشاہ بن بیٹھا۔ ۱۱۵۱ھ میں ہندوستان پر محمد شاہ کے عہد میں لشکر کشی کی۔ بہانہ یہ بنایا کہ افغانستان سے فرار شدہ لوگوں کے بارہ میں محمد شاہ نے اس کے سفیر کو مناسب جواب نہیں دیا۔ امرا کی چپقلش اور غداری اور بدنظمی سے پانی پت میں محمد شاہ کو شکستِ فاش ہوئی۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر دہلی کی تاریخ کا بدترین حادثہ پیش آیا جو دہلی میں قتلِ عام پر منتج ہوا۔ تقریباً بیس ہزار بے گناہ افراد قتل ہوئے۔ نادر شاہ نے ۵۰ لاکھ روپیہ زرِ تاوان وصول کیا۔ تقریباً ۶۰ لاکھ نقد اور لاکھوں روپے کے جواہر لوٹ کر لے گیا۔ ساتھ ہی کوہِ نور اور تختِ طاؤس بھی۔ محمد شاہ کو مجبور کیا کہ سندھ کے پار کا علاقہ ایران کے حوالے کر دے نادر شاہ نے جب دہلی فتح کر لی تو اس کے دوسرے بیٹے نصر اللہ کی شادی محمد شاہ کی بیٹی سے ہوئی۔ کہتے ہیں کہ شادی کی کسی رسم میں دولہا دولہن سے کہا گیا کہ اپنے اجداد کے نام سات پشتوں تک بتائیں۔ شہزادے نے کہا۔ نصر اللہ پسر نادر شاہ پسر شمشیر پسر شمشیر (سات پشتوں تک)۔ نادر شاہ نے ایران جانے سے قبل محمد شاہ کو نصیحت کی تھی کہ نظام الملک سے محتاط رہو اور اپنی حکومت کے نظام کو درست کرو۔ نادر شاہ باوجود اس خشونت کے جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھی اپنی ماں اور اپنے پوتے شاہ رخ سے بہت نرمی سے پیش آتا تھا۔ ہر روز سلطنت کے کاموں سے فارغ ہو کر شب کو محفلِ خاص سجتی تھی جہاں پینے پلانے کے علاوہ آزادی سے ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ ایک روز چند خاص دوستوں نے صبح کو اجلاسِ عام

بس محفلِ شب کے باب میں پند و نصائح کی جسارت کر لی۔ حکم ہوا ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے۔ اور فرمایا اس قسم کے احمق زندہ رہنے کے لائق نہیں جو نادر شاہ اور نادر قلی میں فرق بھی نہیں کر سکتے۔

۱۱۵۴ھ میں اتفاق سے نادر شاہ پر حملہ ہوا۔ اسے شک گزرا اس میں اس کے بیٹے رضا قلی کا ہاتھ ہے اس کی آنکھیں نکلوا دی گئیں۔ جب اس کی آنکھیں نکالی جا رہی تھیں تو اس نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا "کہ تم میری آنکھیں نہیں بلکہ ایران کی آنکھیں نکال رہے ہو"۔ بقول محمد مہدی مؤلف تصنیف جہاں فی تاریخ اصفہان، ایک روز نادر شاہ کسی سے بہشت کے بارہ میں بحث کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا جنت میں جنگ و جدال اور دشمن پر فتح پانے کے مواقع ملیں گے۔ جواب نفی میں ملا بولا۔ "پھر جنت میں کیا لطف، وہاں جانے سے کیا فائدہ؟"

نادر شاہ کو جنگ کے علاوہ بلخ و ہرات کے خربوزے اور گھوڑے پسند تھے۔ آخر عمر میں علاوہ کنیزوں کے ۳۴ بیگمات حرم میں تھیں۔

۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ شاہی خیمے میں سویا ہوا تھا اس کے محافظ محمد صالح خان اور محمد قلی خان افشار اس کے خیمے میں داخل ہوئے اور حملہ کیا۔ نادر شاہ کی بیگم نے اسے جگایا شمشیر لے کر مقابلے کے لیے اٹھا لیکن اس کی ٹانگ ایک رسی میں الجھ گئی اور وہ گر پڑا اور حملہ آوروں نے اس کا کام تمام کر دیا۔

نادر شاہ غالباً سب سے پہلا مسلم حکمران ہے جس نے شیعہ سنی اتحاد کی دل سے کوشش کی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ شیعہ حضرات خلفائے راشدین کے بارے میں بدگوئی ترک کر دیں اور سنی حضرات فقہ جعفریہ کو پانچویں فقہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیں۔ اگرچہ نادر شاہ کا دامن داغدار ہے، اس نے دہلی میں قتل عام کیا، اپنے بیٹے رضا قلی کی آنکھیں نکلوائیں اور شاہ طہماسپ کے خاندان کو برباد کیا۔ بقول صاحب جہاں کشای

سلطنت کے آخری سالوں میں اس کی وحشت و بربریت نے دنیا کے بڑے بڑے سفاک حاکموں کو بھلا دیا۔ لیکن اس کے کارنامے بھی عظیم ہیں۔

۱۔ اس نے ایران کو دوبارہ قوت و وحدت و وسعت عطا کی۔

۲۔ روس اور عثمانیہ کو پسپائی پر مجبور کیا اور ان سے اپنے علاقے واپس لیے۔

۳۔ اس نے مسلمانوں کے دو مشہور فرقوں شیعہ اور سنی میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شیعوں کو خلفائے راشدین پر تبرا بند کرنے کو کہا اور سنیوں سے فقہ جعفریہ کو دوسرے چار فقہوں کے برابر مقام دینے کو کہا تاکہ ملتِ اسلامیہ میں اتحاد و یگانگت قائم ہو۔ اگرچہ بدقسمتی سے کامیاب نہ ہو سکا۔

۴۔ اس نے ایرانی بحری قوت قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

نادر شاہ بہت وجیہ و شکیل تھا۔ کڑک دار آواز میں مضبوط ارادے اور بلند حوصلے کا مالک تھا۔ فنِ حرب کا ماہر تھا۔ بے نظیر حافظہ رکھتا تھا۔ سائیکس نے اسے سکندر، نپولین اور تیمور کے برابر مقام دیا ہے۔

(حوالہ کی کتاب۔ نادر شاہ تالیف للکھارت۔ ترجمہ رضا زادہ شفق چاپ تہران سنہ ۱۳۳۹ھ۔ تاریخچہ نادر شاہ۔ ترجمہ رشید یاسمی۔ تاریخ جہانکشای نادری فقہ اللغت آلمانی از

Paul Horn

A History of Persia by Sykes

۲۴۳۔ احمد شاہ ابدالی (۱۷۲۳ء/۱۱۳۵ھ۔ ۱۷۷۳ء/۱۱۸۶) سدوزئی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ اس قبیلہ کا مورثِ اعلیٰ ترین نامی شخص تھا۔ اس کے مرشد خواجہ ابو احمد ابدال چشتی نے اسے ابدال کا لقب دیا تھا۔ اس ترین ابدال کی اولاد میں ایک

شخص سدو نامی تھا جو سدوزئی قبیلہ کا بانی ہوا۔ (سدو اصل میں اسد اللہ یا سعد اللہ تھا جو بعد میں سدو ہو گیا)

احمد شاہ ۱۶ سال کی عمر میں نادر شاہ کے دربار میں پہنچا۔ بعد میں شاہی محافظوں میں شامل ہو گیا۔ ترقی کر کے افغان اور ازبک افواج کا سپہ سالار بن گیا۔ نادر شاہ اس کی دلیری، حسنِ تدبیر اور حسنِ اخلاق کا بے حد معترف تھا۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد ۱۷۴۷ء میں افغانوں نے احمد شاہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس وقت احمد شاہ کی عمر ۲۴۔۲۵ سال تھی۔ اس کے مرشد حضرت صابر شاہ نے اُسے دُرّانی بادشاہ (یعنی موتیوں کی طرح حسین اور پسندیدہ) کا لقب عطا کیا۔ اس کے بعد وہ احمد شاہ دُرّانی کہلانے لگا۔ اگرچہ وہ تاریخ میں احمد شاہ ابدالی ہی رہا۔

احمد شاہ ایک جفاکش، بہادر، منصف مزاج اور پابند شرع بادشاہ تھا۔ برعکس تمام شاہانِ وقت کے وہ لباس، کھانے اور رہن سہن میں نہایت سادگی پسند تھا اس نے اپنے دربار میں جھک کر کورنش بجا لانے کے بجائے شریعت کے مطابق صرف سلام کرنے کو رائج کیا۔ وہ تخت پر نہیں بیٹھتا تھا اور نہ تاج شاہی پہنتا تھا۔ ساری عمر سیر و تفریح اور لہو و لعب سے مجتنب رہا حتیٰ کہ شکار کھیلنا جو اس زمانے کے بادشاہوں کا محبوب مشغلہ تھا اسے پسند نہیں تھا۔ البتہ شعر و شاعری کا ذوق رکھتا تھا اور پشتو اور فارسی میں شعر کہتا تھا۔ کہتے ہیں ایک بار فراغت کے زمانے میں اس نے برصغیر کے مشہور فارسی شاعر واقف لاہوری کو چند روز کے لیے آنے کی دعوت دی۔ واقف لاہوری نے احمد شاہ ابدالی کے حضور میں پہنچ کر یہ شعر پڑھا

ندیدہ، ہیچ کس ظلِ پیمبر بحمد اللہ کہ ظل اللہ دیدم

عام افغانی اسے ولی اللہ سمجھتے ہیں۔ نادر شاہ نے اس کے بارہ میں سچ کہا تھا۔

"من در تمام ایران و توران و ہندوستان مثل احمد خان مرد حمیدہ خصائل و پسندیدہ

افغان ندیدہ ام"۔

احمد شاہ ابدالی پہلا بادشاہ ہے جس نے افغانستان میں قومی حکومت قائم کی۔ اس لیے علامہ نے اسے مؤسسِ ملتِ افغانیہ کہا ہے ؎

داد افغان را اساسِ ملتی

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر بہت سے حملے کیے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو شکستِ فاش دی اور ہمیشہ کے لیے مرہٹوں کی قوت کو ختم کر دیا۔ ۱۷۷۳ء میں اس کا انتقال ہوا۔[۱]

۱۔ حیات افغانی: تالیف محمد حیات اللہ خاں طبع لاہور ۱۸۶۵ء

۲۔ تاریخِ سلطانی تالیف محمد سعادت خاں لکھنؤ ۱۸۵۵ء

۳۔ سراج التواریخ۔ تالیف میرزا محمد خاں۔ طبع کابل۔

۴۔ احمد شاہ بابا افغانی از م۔ غبار (میر غلام محمد غبار) طبع کابل ۱۳۲۲ھ

۲۴۴۔ ٹیپو سلطان۔ حیدر علی خان بانی سلطنتِ میسور کا فرزند اکبر۔ ولادت ۱۰ نومبر ۱۷۵۰ء ۲۰ ذی الحجہ ۱۱۶۳ھ بروز جمعہ

حیدر علی خان نرینہ اولاد سے محروم تھا اس نے آرکاٹ کے ایک مشہور بزرگ ٹیپو مستان ولی کے مزار پر حاضر ہو کر بیٹے کے لیے دعا کی۔ خدا نے بیٹا دیا اس کا نام حیدر علی نے بزرگ صوفی کے نام پر ٹیپو رکھا (ٹیپو کے معنی چیتے کے ہیں)۔

۱۷۶۷ء میں حیدر علی خان نے نظام حیدر آباد کے پاس ایک وفد شہزادہ ٹیپو سلطان کی سرکردگی میں گراں بہا تحائف کے ساتھ بھیجا۔ نظام نے شہزادے کو نصیب الدولہ اور فتح علی خان بہادر کے خطاب دیئے۔ موخر الذکر خطاب نام کا جزو بن گیا۔ سلطان نے تمام علوم مروجہ اور فنونِ سپہ گری میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سلطان کے والد حیدر علی کی زندگی اولوالعزمی، کشمکش اور نشیب و فراز کی داستان ہے۔ سلطان نے بھی ہر مرحلہ

میں اور ہر مہم میں باپ کا پورا پورا ساتھ دیا اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ بہت سی جنگیں سر کیں اور اپنی جوانمردی، شجاعت اور ذہانت کے جوہر دکھائے۔

باپ کی وفات کے بعد ۲۶ دسمبر ۱۷۸۲ کو بروز جمعرات مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ سلطان جس سلطنت کا وارث بنا تھا اگرچہ رقبے، آبادی، زرخیزی اور حسنِ انتظام کے لحاظ سے بہت بلند پایہ تھی لیکن اس کے ساتھ ہی رزم و پیکار کا بھی ایک سلسلہ چلا آرہا تھا۔ نظام، مرہٹے اور انگریز تینوں اس کے دشمن تھے۔ سلطان نے تخت نشین ہوتے ہی کئی جنگوں میں انگریزوں کو شکست فاش دی اور ان کی سازشوں کو کچلا۔

۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کے محاصرے میں میر صادق اور قمرالدین کی غداری سے بے مثل بہادری اور جوانمردی سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

سلطان خود بھی عالم تھا اور اہلِ علم کا قدر دان تھا اور صاحب کردار تھا۔ صبح کی نماز کے بعد تلاوتِ قرآن پاک ضرور کرتا تھا، ہر وقت باوضو رہتا تھا۔ نماز باقاعدہ ادا کرتا تھا۔ سلطان شجاعت میں بے مثل شہسواری اور نیزہ بازی میں بے نظیر تھا اس کے زمانے میں تجارت، زراعت اور صنعت کو غیر معمولی ترقی ہوئی رعایا کے ساتھ سلطان کا رویہ نہایت عادلانہ، فیاضانہ اور مشفقانہ تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ بھی سلطان کا سلوک سچے مسلمان کی طرح تعصب سے پاک تھا۔ سینکڑوں غیر مسلم اس کے ہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔[1]

۱۔ حسین علی خان کرمانی۔ نشان حیدری (فارسی) معروف بہ تاریخ ٹیپو سلطان ۱۸۹۰ء

۲۔ محمود خان محمود بنگلوری۔ تاریخ سلطنت خداداد ۱۹۳۴ء

۳۔ سید امجد علی۔ سوانح حیدر علی سلطان ۱۹۲۰ء

۴۔ زین العابدین شستری۔ فتح المجاہدین (فارسی)

۲۴۵۔ سطوت (بفتح سین وسواؤ) ماقہر، غلبہ، وقار، شان وشوکت

۲۴۶۔ وداد۔ دوستی و محبت

۲۴۷۔ خواجۂ بدر و حنین۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۲۴۸۔ بہرام فر۔ فر۔ شان وشوکت۔ فارسی میں سعادت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قدیم بادشاہوں کے سر پر اہورا مزدا کا جو نور سایہ افگن رہتا تھا وہ فرّ کیانی کہلاتا تھا

شاپور۔ ایران میں شاپور تین ہوئے ہیں۔ شاہپور اول (۱) دوسرا ساسانی بادشاہ (۲۴۱-۲۷۲) جس نے رومیوں کے ساتھ شدید جنگوں میں فتح حاصل کی۔ روم کے شہنشاہ کو قید کر کے لایا۔ اسی کے زمانے میں مانی نے اپنے دین کی تبلیغ شروع کی

(۲) شاپور دوم دسواں ساسانی بادشاہ (۳۱۰-۳۷۹) جو پیدائش سے پہلے ہی بادشاہ منتخب ہو گیا تھا اس نے بھی ایران کے مغرب میں سلطنت کو وسعت دی اور رومیوں سے شدید جنگیں لڑیں۔

۳۔ شاپور سوم۔ بارھواں ساسانی بادشاہ (۳۸۳-۳۸۸) شاپور دوم کا بیٹا۔

بہرام۔ ایران کا ساسانی بادشاہ۔ اس نام کے ایران میں کئی بادشاہ ہوئے بہرام اول چوتھا ساسانی بادشاہ۔ شاپور اول کا بیٹا (۲۷۲-۲۷۶)

بہرام دوم۔ پانچواں ساسانی بادشاہ بہرام اول کا بیٹا (۲۷۶-۲۹۳)

بہرام سوم۔ (۲۹۳) صرف چند ماہ حکومت کی۔

بہرام چہارم۔ تیرھواں ساسانی بادشاہ (۳۸۸-۳۹۹) جو کرمانشاہ کے نام سے مشہور ہوا۔

بہرام پنجم۔ پندرھواں ساسانی بادشاہ (۴۲۱-۴۳۸) جو بہرام گور کے نام سے مشہور ہوا۔

۲۴۹۔ الیاسؑ۔ مشہور پیغمبر۔ انجیل یوحنا میں ان کو ایلیاہ نبی کہا گیا ہے۔ شہر بعلبک ان کی رسالت و ہدایت کا مرکز تھا۔ قرآنِ پاک۔ سورۃ الانعام آیت ۸۵۔ والصافات آیات ۱۳۱-۱۲۳ میں ان کا ذکر ہے۔ عام خیال ہے کہ جس طرح سمندر میں حضرت خضرؑ رہنمائی کرتے ہیں اسی طرح خشکی میں حضرت الیاسؑ بھولے بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں (قصص القرآن۔ حفظ الرحمٰن۔ جلد دوم۔ ص ۳۲-۳۵)

۲۵۰۔ خاتم (ع) بفتح یا کسرتا۔ انتہا، خاتمہ، انگشتری، انگوٹھی، مہر، خواتم جمع

خاتمِ سلیمان کی روایت[1] قطعی ادبی ہے۔ یہ روایت یوں ہے کہ حضرت سلیمان کی ایک بیوی جس کا نام امینہ تھا بت پرست تھی اور اپنے باپ کا مجسمہ بنا کر اس کی پرستش کیا کرتی تھی۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو یہ سزا دی کہ جس مدت تک امینہ نے ان کے گھر میں بت پرستی کی تھی، اسی مدت تک کے لیے وہ تختِ سلطنت سے محروم کر دیئے گئے اور ان کی انگشتری جس پر اسمِ اعظم کندہ تھا اور جس کی برکت سے وہ جن و انس پر حکومت کرتے تھے، ان کی باندی جرادہ کے ذریعے شیطان (اہرمن) کے ہاتھ لگ گئی اور وہ بصورتِ سلیمان علیہ السلام اُن کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا۔ اور پھر مدت ختم ہونے کے بعد انگشتری شیطان کے ہاتھ سے دریا میں گر گئی اور مچھلی اس کو نگل گئی۔ اور وہ مچھلی حضرت سلیمانؑ کے پاس شکار ہو کر آئی اور اس طرح اس کے پیٹ میں سے انگشتری نکال کر انہوں نے اپنا تختِ سلطنت واپس لے لیا۔

۲۵۱۔ انبارِ دُر۔ دُر۔ موتی۔ انبارِ دُر۔ موتیوں کا ڈھیر۔

۲۵۲۔ زنگ شتر۔ اونٹ کی گھنٹی

۱۔ مفسرین کے نزدیک یہ اسرائیلی روایات میں سے ہے۔ قصص القرآن، جلد دوم ص ۱۴۶۔ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

۲۵۳۔ قباد ۔ ایران کا قدیم بادشاہ

۲۵۴۔ ہند نے مانا نہ قانونِ فرنگ

برصغیر ہندوستان میں اس وقت کی سول نافرمانی کی ایک تحریک کی طرف اشارہ ہے

۲۵۵۔ پر نم اشکوں سے مری خاک کن

علامہ نے ۱۹۱۹ء میں دکن کا سفر کیا تھا۔

۲۵۶۔ رود کا دیری ۔ میسور کا دریا جو سرنگاپٹم کے قریب سے گزرتا ہے۔

تیرے ساحل پر تھا شہرِ مہ نگار

شہر سرنگاپٹم جو دریائے کاویری کے کنارے آباد ہے۔

۲۵۷۔ جیحوں ۔ مشہور دریا جسے آمو بھی کہتے ہیں اور جسے ایران و توران کے درمیان حدِ فاصل مانا جاتا تھا اور دریا کے پار ممالک کو ماوراالنہر کہتے تھے۔

۲۵۸۔ عرش ۔ فلک الافلاک ۔ فلک ہفتم ۔ خداوند تعالیٰ نے ساتویں آسمان پر عرش کو پیدا کیا اور ملائکہ کو اس کے اٹھانے اور تعظیم کرنے کا حکم دیا جس طرح انسان کو مکہ کی زیارت اور تعظیم کا حکم دیا ہے ۔ کبھی عرش تخت شاہی کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے سورۂ نمل، آیہ ۲۳، ۳۸ ۔ حضرت علی سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کو چار نور سے پیدا کیا۔ نورِ سرخ، نورِ زرد، نورِ سبز نورِ سفید، جن سے سرخ ہیز، زرد اور سفید رنگ پیدا ہوئے۔

(فرہنگ معین)

۲۵۹۔ چونکہ عرضِ زندگی میں ہے ثبات

عرضِ زندگی وہ مختصر زندگی جو سراپا عمل ہو اس طویل سے بہتر جو یونہی گزر جائے

۲۶۱۔ طلسم ۔ بکسر طا و لام ۔ (عربی میں بکسرِ طا و فتحِ لام) ایک کاغذ کے ٹکڑے یا تانبے کی تختی پر جادو گر نقش لکھتے ہیں جس کے پاس رکھنے سے مصیبت اور آفت

سے بچا جا سکتا ہے۔

۲۶۲۔ سیمیا۔ علم جادو، علم طلسم۔ نیرنگ شعبدہ۔ افسون

۲۶۰۔ تسلیم و رضا ۔ دیکھئے توضیح اضافی ۲۹۱

رضا

۲۶۳۔ لایزال ۔ زوال ناپذیر۔ ابدی۔ لازوال

۲۶۴۔ حجاب اکبر۔ العلم حجاب الاکبر۔ علم سب سے بڑا حجاب ہے

۲۶۵۔ فتر (بکسر قاف) پوست۔ چھلکا

۲۶۶۔ چھوڑ کر نکلا میں سب حول و قصور

جہاں علامہ تنہا سفر شروع کرتے ہیں۔ صاف لفظوں میں یہ نہیں کہا کہ اس مقام پر رومی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ ایسا کہنا سوءادب تھا۔

۲۶۷۔ حیدر (ع) (بفتح حا و دال) شیر کوتاہ قد۔ (فرہنگ عمید) شجاعت کی وجہ سے حضرت علیؓ کا لقب۔ حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ تھے ۳۵ھ میں خلیفہ بنے۔ ۴۰ھ میں شہید ہوئے۔

خیبر۔ مدینے کے شمال میں یہودیوں کی ایک اہم بستی تھی جہاں ان کے بہت مضبوط قلعے تھے۔ خیبر کی فتح کا سہرا حضرت علیؓ کے سر ہے۔ مرحب مشہور سردار حضرت علیؓ کی شمشیر کا شکار ہوا۔

۲۶۸۔ زندیق ۔ کافر، بے دین۔ ظاہر میں مسلمان دل سے کافر۔ مانی کے خاص پیروکار صدیق کہلاتے تھے۔ اسلام کے زمانے میں یہ لفظ بگڑ کر زندیق بن گیا۔

۲۶۹۔ مانی فریب ۔ آیت قرآنی

۲۷۰۔ لاہوتی ۔ خداوندی۔ اصل میں لاہ بمعنی الٰہ تھا۔ واؤ اور تا کا مبالغہ کے لیے اضافہ

کیا گیا جیسے جبروت اور ملکوت میں۔

۲۷۱۔ جبروتی۔ جبروت سے۔ صیغۂ مبالغہ بمعنی قدرت و عظمت الٰہی

۲۷۲۔ رومی۔ مشہور شاعر فارسی دیکھئے گزشتہ توضیح نمبر ۲۴۳)

۲۷۳۔ عطار۔ فریدالدین عطار (قرن ششم و ہفتم)

۲۷۴۔ ابوذر غفاری۔ بوذر۔ مشہور صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۲۷۵۔ طغرل۔ سلجوقی خاندان کا (ایران) مشہور بادشاہ۔ ۴۲۹ھ میں تخت نشین ہوا ۴۵۵ھ
میں وفات پائی۔

۲۷۶۔ سلجوق۔ ایک ترک قبیلے کا نام ہے جو اپنے مورثِ اعلیٰ سلجوق کے نام سے مشہور ہے
طغرل اور سنجر اسی خاندان کے مشہور بادشاہ تھے۔ سلجوقیوں کا عہد تاریخ ادبیات
ایران میں بہت اہم ہے۔

۲۷۷۔ سنجر۔ مشہور سلجوقی بادشاہ ۵۱۱ھ میں تخت نشین ہوا۔ ۵۵۲ میں وفات پائی۔

۲۷۸۔ سلیمانی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے نسبت ہے کہ وہ بہت بڑے بادشاہ بھی تھے

۲۷۹۔ سلمانی۔ حضرت سلمان فارسی سے نسبت کہ وہ بہت بڑے صحابی اور تقویٰ اور
پرہیزگاری میں یگانۂ روزگار تھے۔

۲۸۰۔ فقر۔ وحقیقۃ الفقر اَنْ لا تفتقر الیٰ من ھو مثلک
فقر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہی جیسی ہستی (یعنی کسی بندہ) کا محتاج نہ ہو۔ حضرت
عبدالقادر جیلانی۔ ص ۸۷۔ تصوف اسلام عبدالماجد دریا آبادی، لاہور ۱۳۹۳ھ

۲۸۱۔ المان۔ جرمنی۔ انقلاب جرمنی۔ جن دنوں جاوید نامہ لکھا گیا جرمنی ہٹلر کی آمریت
کے زیر اثر ہمہ گیر ترقی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور اس انقلاب کے آثار پیدا ہو
رہے تھے جو ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کا سبب بنا۔ علامہ کا اسی انقلاب
کی طرف اشارہ ہے۔

روس کا انقلاب ۱۹۱۹ء میں روس میں بالشیوک انقلاب آیا اس کی طرف اشارہ ہے۔

۲۸۲ دو نبی۔ مراد ہے مرزا غلام احمد اور مرزا محمد علی باب سے

مرزا غلام احمد کی وفات ۱۸۴۰ء/۱۸۳۹ء میں ہوئی اور وفات ۱۹۱۸ء میں۔ موضع قادیان تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب کا رہنے والا تھا۔ بہت سے مناظرے کیے بہت سے دعوے کیے۔ اسی میں مسیح موعود اور نبی ہونے کا دعویٰ شامل ہے۔ مرزا غلام احمد نے سرکار انگریزی کی خوشنودی کے لیے جہاد کو حرام قرار دے دیا تھا۔

بابیت کا بانی مرزا علی محمد شیرازی ۱۲۳۶ھ/۱۲۳۵ھ ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۱ء/۱۸۱۹ء کو شیراز میں متولد ہوا۔ بچپن میں اس کے باپ سید محمد رضا بزاز کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دنوں بزازی کا کام کیا۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر پچیس سال کی عمر میں باب ہونے کا دعویٰ کیا۔ شیعان ایران کے ایک فرقے شیخیہ (پیروان شیخ احمد) کا عقیدہ تھا کہ ہر زمانے میں امام منتظر یا امام غائب کسی نہ کسی شخص سے بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں جسے وہ باب (دروازہ) کہتے تھے۔ مرزا علی محمد نے دعویٰ کیا کہ وہ واسطہ اور باب میں ہی ہوں۔ اس پر فرقہ شیخیہ کے کچھ لوگوں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔

باب نے اپنی موت سے پہلے ایک شخص کے ظہور کی پیش گوئی کی تھی جسے بابی من یظہرہ اللہ (جسے اللہ ظاہر کرے) کہتے تھے۔ چنانچہ میرزا علی محمد کی موت کے بعد ایک بابی مرزا حسین علی ملقب بہ بہاء اللہ نے من یظہر اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے بعد اس کے پیروکار بہائی کہلانے لگے۔ بہاء اللہ نے اپنی تحریک کو بین الاقوامی رنگ دینے کی کوشش کی اور دعویٰ کیا کہ وہ تمام مذاہب و ادیان کی بنیادی وحدت و اشتراک بحال کرنے آیا ہے۔ بہائیت کو مغربی ممالک میں بالخصوص امریکہ میں جہاں

ہر خیال آسانی سے رواج پا جاتا ہے کچھ کامیابی نصیب ہوئی ۔ ایران میں اس مذہب کی اشاعت پر پابندی ہے ۔

مرزا علی محمد باب اپنے مذہب کو ناسخ دینِ اسلام اور اپنی الہامی کتاب بیان کو ناسخ قرآن سمجھتا تھا۔ بابی (جو اب بہائی کہلاتے ہیں) قرآنی آیات کی تاویل باطنیوں کی طرح کرتے ہیں ۔ موت، قبر، قیامت، میزان صراطِ مستقیم وغیرہ کے تمثیلی معنی بیان کرتے ہیں اسی طرح حج کا مفہوم ان کی نظر میں "خدائے برتر کی مشیت، ارادہ، قضا و قدر کے ارد گرد پھرنا ہے ۔ ویسے بہائی مذہب میں خانہ کعبہ کی بجائے بغداد میں بہاء اللہ کا گھر اور شیراز میں مرزا علی محمد کا گھر مقاماتِ حج ہیں ۔ بہائی مذہب میں تین نمازیں اور تیس روزے فرض ہیں اور سود حرام نہیں ۔

توضیح نمبر ۲۸۳۔ خودی (نیز دیکھئے توضیح نمبر ۲۸)

خودی کے لغوی معنی تو ہیں تکبر و غرور کے۔ اسی لیے اسلامی ادبیات میں معلمینِ اخلاق نے خودی کی مذمت کی ہے اور صوفیائے کرام خودی کو وصالِ ذاتِ حق میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اسے فنا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبال نے بنیادی طور پہ تو خودی سے مراد شعورِ ذات ہی لیا ہے، لیکن ان کے ہاں خودی کے معنی بے حد وسیع گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔ علامہ کا تصورِ خودی فکر انگیز بھی ہے اور انقلاب آفریں بھی۔ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں کہ یہ شعور تین طرح کا ہے۔ ایک شعورِ خویشتن، ایک شعورِ غیر اور ایک شعورِ حق (نمبر الف)

حق تعالیٰ نے ہر انسان کو جسم و ذہن اور قلب و نظر کی بے پناہ صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا شعور خودی ہے اور یہی شعور حقیقی زندگی ہے۔ جاوید نامہ میں علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

ع

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است

؎

خویشتن را وانمودن زندگی است

ضربِ خود را آزمودن زندگی است

خودی جذبۂ خود نمائی اور آرزوئے ارتقا بھی ہے جو کائنات کی ہر شئے میں موجود ہے۔ جس قدر خودی توانا ہے اسی قدر وجود ترقی یافتہ اور کامل ہے۔ قطرۂ آب شبنم کی شکل میں ضعفِ خودی کی وجہ سے جلد ہی فنا ہو جاتا ہے لیکن وہ قطرۂ آب جو صدف کے سینے میں خلوت گزیں ہو کر اپنی خودی کو مستحکم کر لیتا ہے وہ گوہر آبدار بن جاتا ہے۔ اس سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی انسان ہے ؎

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند ہستیِ بی مایہ را گوہر کند

نمبر الف۔ شاہد اول شعورِ خویشتن خویش را دیدن بنورِ خویشتن

شاہدِ ثانی شعورِ دیگری خویش را دیدن بنورِ دیگری

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

خدا کا وجود اور اس کا تصور انسانی خودی کے وجود اور اس کے تصور سے وابستہ ہے۔

ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

گویا یہ حقیقت اس حدیثِ قدسی یا صوفیا کے اس قول کی آئینہ دار ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

ذاتِ حق خود ایک اَنا ہے اس کی ماہیت بھی خودی ہے جو انائے کبیر یا انائے مطلق یا خودی مطلق ہے۔ اس انائے کبیر نے ذوقِ نمود میں اپنے اندر سے لاتعداد "انا" یا خودی کے مراکز خلق کیے ہیں۔ یہ جہان چار سُو خدا کی خودی ہی سے تخلیق ہوا ہے۔[1] یہ تصور اس حدیثِ قدسی کے قریب تر ہے۔

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

جاوید نامہ میں علامہ اقبال فرماتے ہیں

از خودی طرحِ جہانی ریختند دلبری با قاہری آمیختند

ہر کجا پیدا و ناپیدا خودی برنمی تابد نگاہِ ما خودی

نارہا پوشیدہ اندر نورِ او ست جلوہ ہای کائنات از طورِ او ست

علامہ کے ہاں خودی کا تصور درحقیقت قرآنِ کریم کے نیابت الٰہی کے تصور کا آئینہ دار ہے خطبات میں علامہ نے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ کی تفسیر یوں کی ہے کہ اس آیت میں جس امانت کا ذکر ہے وہ یہی شخصیت یا احساسِ خودی کی ذمہ داری تھی۔ اسی امانت یا شعورِ خودی کی بدولت انسان اشرف المخلوقات، خلیفۃ اللہ فی الارض اور مسجود ملائک بنا اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ نہ صرف حقایقِ اشیا کا علم حاصل کر سکے بلکہ اپنی ضرورت کے مطابق فطرت

---

[1] نہ اورا بی نمودِ ما کشودی نہ ما را بی کشودِ او نمودی

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

میں تصرف بھی کر سکے۔ اپنی اسی استعداد کی بدولت وہ رفعت و کمال کے بلند ترین مدارج تک پہنچ سکتا ہے جہاں اس کی ہمتِ مردانہ تسخیرِ کائنات کر کے یزداں تہِ دام لانے کی سعی کرتی ہے۔

جاوید نامہ کے آغاز میں یہی حقائق و مطالب بیان ہوئے ہیں ـــــ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جاوید نامہ کا موضوع بھی یہی مطالب ہیں اور آخر میں ندائے جمال بھی اسی حقیقت کو بیان کرتی ہے۔

زندگی خواہی خودی را پیش کن   چار سُو را غرق اندر خویش کن
باز بینی من کیم تو کیستی   در جہاں چوں مُردی و چوں زیستی

علامہ صوفیا کی طرح اپنی خودی کو خدا کی ذات میں فنا کر دینے کے قائل نہیں بلکہ خدا کے نور کے سامنے اپنی خودی کو مستحکم رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو خدا کے حضور میں اپنی ذات کو استوار رکھے وہی شخص کامل عیار یعنی انسانِ کامل ہے۔ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں۔

پیشِ این نور ار بمانی استوار   حی و قایم چوں خدا خود را شمار

خودی خودسری نہیں بلکہ احکامات و حدود کی پابند ہے۔ علامہ کے نزدیک خودی کی تربیت کا پہلا مرحلہ اطاعت، دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس اور تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی ہے۔ نیابتِ الٰہی کے مقام تک پہنچنے کے لیے خودی کے واسطے اطاعتِ احکامِ خداوندی اور آئین کی پابندی لازمی ہے ورنہ خودی خودسری ہے، ابلیسیت ہے، آمریت ہے۔

ہر کہ تسخیرِ مہ و پروین کند   خویش را زنجیری آئین کند

توضیح نمبر ۲۸۴ ـ عقل و عشق (نیز دیکھئے توضیح نمبر ۳۲)

علامہ نے جاوید نامہ میں عشق و عقل کے تصورات پر بالخصوص زرتشت، سعید حلیم پاشا، ابدالی اور حضورِ حق کے ضمن میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ علامہ کا تصورِ عشق بہت وسیع، ہمہ گیر اور حیات بخش ہے۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم "ایک میلانِ بقا و ارتقا بھی ہے، اعلیٰ مقاصد کی لگن کا نام بھی[1]" اور بقول آلِ احمد سرور "علامہ کی نظر میں عشق وہ روحانی کیفیت ہے جو وجدان سے

---

[1] فکرِ اقبال۔ خلیفہ عبدالحکیم ص ۳۶۲

تعلق رکھتی ہے جس میں جذبۂ تسخیر، جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا تینوں پائے جاتے ہیں۔[1] ان کے یہاں عشق ذوقِ نظر ہے، نورِ یقین ہے، تماشائے ذات ہے، سراپا حضور ہے، سکون و ثبات ہے، سوز و ساز ہے گرمیٔ حیات ہے، لذتِ تخلیق ہے، دمِ جبریل ہے، دلِ مصطفےٰ ہے، صدقِ خلیل ہے، صبرِ حسین ہے اور معرکۂ بدر و حنین ہے۔[2]

علامہ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں کہ وہ علم جو عشق سے بہرہ ور نہیں وہ صرف تماشا خانۂ افکار ہے یا صرف افسونگری ہے۔

علم تا از عشق برخوردار نیست　　جز تماشا خانۂ افکار نیست

ع　علم بے روح القدس افسونگری است

عشق سلطان ہے برہانِ مبین ہے، دونوں عالم عشق کے زیرِ نگین ہیں، عشق جب کامل ہو جاتا ہے تو وہ آدم گر بن جاتا ہے۔ خون میں تڑپنا عشق کی آرزو ہے۔

عشق سلطان است برہانِ مبین　　ہر دو عالم عشق را زیرِ نگین

۱۔ اقبال اور ان کا فلسفہ۔ آلِ احمد سرور

۲۔ ع　عشق سراپا یقین اور یقیں فتح باب　(ضربِ کلیم)

ع　علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب　(ضربِ کلیم)

ع　عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات　(ضربِ کلیم)

ایک دانش نورانی، اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات　(ضربِ کلیم)
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

ع عشق چوں کامل شود آدم گراست

ع عشق را درخوں تپیدن آرزوست

علامہ کے کلام میں عام طور پر عشق کے ساتھ ساتھ عقل کا بھی ذکر ہے اور بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ ان کی نظر میں عقل و عشق دو متضاد قوتیں ہیں، عقل عشق کی حریف ہے اور مردود ہے۔ لیکن حقیقت کچھ یوں نہیں۔ علامہ کی نگاہ کلیت بین ہے۔ ان کی نظر میں حقیقت کا ہر پہلو ہوتا ہے جس طرح عشقِ خانہ خراب کی ہر ادا ان کے یہاں پسندیدہ نہیں اسی طرح عقل ذوفنون کا ہر انداز بھی مردود نہیں۔ وہ عشق جو جرأتِ رندانہ سے محروم ہے ان کی نظر میں روباہی ہے۔

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی

عقل کا وہ انداز جو مکاری اور عیاری سے عبارت ہے ان کی نگاہ میں بولہبی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے یہاں علم و حکمت مغلوب و مردود نہیں بلکہ انہوں نے ان کی افادیت اور اہمیت کو بھی واضح کیا ہے اور ان کے حصول کی تلقین بھی فرمائی ہے۔ یہ انہی کا شعر ہے

؎ فطرت کو خرد کے رو برو کر تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر

حضرت علامہ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں کہ یہ جہانِ آب و خاک عقلِ انسانی ہی سے مسخر کیا جا سکتا ہے۔

عقلِ آدم بر جہاں شبخون زند

احمد شاہ ابدالی کے ذریعے علم و حکمت کی اہمیت یوں واضح کرتے ہیں کہ مغرب کی قوت نہ چنگ و رباب ہے نہ رقصِ دختراں بے حجاب ہے، نہ عریانی ہے نہ خطِ لاطینی ہے بلکہ اس کی قوت اس کے فروغ کا سرچشمہ علم و فن ہیں۔ نوجوانانِ شرق کو تلقین کرتے ہیں کہ اگر تم کچھ بننا چاہتے ہو تو دماغ سوزی کرو، راتوں کو چراغ کا دھواں کھاؤ کہ علم و فن بغیر محنت و مشقت کے حاصل نہیں ہوتے۔

جاوید نامہ ہی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ حکیم نے حکمت کو خیرِ کثیر کہا ہے۔ یہ نعمت جہاں بھی ملے اسے حاصل کرو۔ علم و حکمت کائنات کے مفسر بھی ہیں اور مسخر کرنے والے بھی ـــــ لیکن علم بے سوز دروں تمام شر ہے۔ اک تماشا خانۂ افکار ہے، سحر سامری ہے، افسونگری اور گمراہی ہے۔

جاوید نامہ ہی میں علامہ عقل و عشق کے تعلق کو یوں واضح کرتے ہیں کہ عقل مغرب کے لیے سازِ حیات ہے اور عشق مشرق کے لیے رازِ کائنات، عقل عشق سے حق شناس بنتی ہے اور عشق عقل سے محکم بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور جب عقل و عشق باہم ایک ہو جائیں تو ایک نئے عالم کی تخلیق کرتے ہیں۔ علامہ مشرق کے عوام کو دعوت دیتے ہیں کہ عقل و عشق کے امتزاج سے ایک نئے عالم کی بنیاد رکھو۔ مغرب کے آسمانوں میں عصرِ تازہ نہیں اس کی تہذیب دم توڑ رہی ہے کیونکہ اس کی بنیاد محکم نہیں کہ جذبۂ عشق سے محروم ہے[1]

علامہ کی نظر میں عقل و عشق دو متضاد قوتیں نہیں بلکہ عشق یا وجدان عقل ہی کی ارتقا یافتہ

۱۔ قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است
گر کسی شبہا خورد دود چراغ — گیرد از علم و فن و حکمت سراغ
گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر — ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر
دشت را گوید حبابی دہ، دھد — بحر را گوید سرابی دہ، دہد
غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیزدہ
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است — چشمِ شاں صاحب نظر، دل مردہ است

شکل ہے۔ ذوقِ نگہ کو جرأتِ رندانہ حاصل ہو تو عشق ہے اور ذوقِ نگہ جرأت رندانہ سے محروم ہو تو عقل ہے[1]۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں عقل ایک خاص مقام تک عشق کا ساتھ دینے پر مامور ہے اس کے بعد اس کے پَر جلنے لگتے ہیں[2]۔ اگرچہ ابتدائی مرحلوں میں عقل ہی کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ تسخیرِ مقامِ رنگ و بو عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے لیکن حقیقتِ اولیٰ کا ادراک عشق ہی کر سکتا ہے۔ عقل حقیقت کا تجزیہ کر کے اس کو جزو در جزو سمجھتی ہے اور عشق یک لخت حقیقت کا کلی طور پر ادراک کر لیتا ہے۔ عقل کی نظر حقیقت کے صرف ایک پہلو پر ہوتی ہے اور عشق کی نظر اس کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوتی ہے۔ عقل حواس کی تابع ہے اور عشق حواس سے برتر۔ عقل شنید ہے اور عشق دید ہے، عقل چراغِ راہ ہے اور عشق منزلِ مقصود ہے، عقل ابن الکتاب اور عشق ام الکتاب ہے، عقل خود بین ہے اور دانش برہانی ہے، عشق جہاں بین ہے اور دانش نورانی ہے، عقل کی زد میں یہ مادی جہان ہے اور عشق کی زد میں لامکان ہے، عقل جلوت طلب اور عشق خلوت طلب ہے۔

علامہ کی حقیقت شناس اور کلیت بین نظر میں عقل کے چار مختلف پہلو ہیں۔

۱۔ وہ جو عام ضروریاتِ زندگی پورا کرنے میں ہماری مدد و معاون ہے۔ جو زندگی کے

۱۔ عقل ہم عشق است — از ذوقِ نگہ بیگانہ است
لیکن آں بیچارہ را — آں جرأتِ رندانہ نیست

۲۔ علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو — دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
بر مقامِ جذب و شوق آرد ترا — باز چوں جبریل بگذارد ترا
عشق کس را کی بخلوت می برد — او ز چشمِ خویش غیرت می برد

(جاوید نامہ)

تحفظ کے لیے ایک آلے کی حیثیت رکھتی ہے جو حواس کی دستِ نگر ہے اور تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کے لیے ناگزیر ہے ؎

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

یا ؏ عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند

۲۔ وہ جو شر پر مبنی ہے اور عیاری و مکاری سے عبارت ہے جو اھرمنیت کی ایک صورت ہے۔ علامہ نے جسے عام طور پر ابراہیم و نمرود، موسیٰ و فرعون، حضرت مصطفیٰ ﷺ اور ابولہب اور جاوید نامہ میں زرتشت و اہرمن کے تقابلی اشارات و تمثیلات و تلمیحات سے واضح کیا ہے ؎

تا نہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن بپا
عشق تمام مصطفیٰ ﷺ، عقل تمام بولہب

۳۔ عقل کی ارتقاء یافتہ شکل جو وجدان یا عشق ہے جسے علامہ نے دانشِ نورانی، دمِ جبرئیل اور دلِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہا ہے جس کی افادیت و اہمیت سہ گونہ ہے۔

(الف) اس سے عقل خود شناس بنتی ہے ؏

زیرکی از عشق گردد خود شناس

(ب) اس سے حقیقتِ اولیٰ کا ادراک حاصل ہوتا ہے یعنی جو تماشائے ذات ہے۔

؏ عشق در خلوت کلیم اللہی است

؏ عشق او بر لامکاں شبخون زند

(ج) وہ جدوجہد، جستجو اور جوشِ عمل کا زبردست محرک ہے اور استغنا، اخلاص اور ایثار جیسی اعلیٰ صفات کی بنیاد ہے گویا وہ صدقِ خلیلی بھی ہے، گرمیِ حیات بھی اور مسخرِ کائنات بھی

عشق چون با زیرکی ہمبر شود　　نقشبندِ عالمِ دیگر شود

علم را مقصود اگر باشد نظر　　می شود ہم جادہ و ہم راہبر

عشق را در خوں تپیدن آبرو است

ارّہ و چوب و رسن عیدینِ اوست

۴۔ وہ جو فلسفہ اور منطق سے عبارت ہے جس کا سکہ الہیات میں نہیں چلتا جو چراغ راہ تو ہے منزل نہیں ہے، جو پردۂ محمل سے دور غبارِ ناقہ میں گم ہے، منطقی فلسفیانہ موشگافیوں میں عمرِ عزیز ضائع کر دیتا ہے لیکن حقیقتِ اولیٰ کا ادراک کماحقہ نہیں کر پاتا جیسا کہ علامہ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں۔

بی تجلی مردِ دانا رہ نبرد　　از لکد کوبِ خیالِ خویش مرد

توضیح نمبر ۲۸۵　زمان　(نیز دیکھئے توضیح نمبر ۴۱)

زروان جاوید نامہ میں یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ ہر انسانی تدبیر زمان کی تقدیر کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ زندگی، موت اور حشر سب زمان ہی کی حرکتیں ہیں۔ انسان، فرشتے اور کائنات سب زمان میں واقع ہیں۔

زمان و مکان کا عامیانہ تصور تو یہ ہے کہ زمان کو لمحات، منٹوں اور گھنٹوں سے ناپا جاتا ہے اور مکان کو فاصلوں اور سمتوں سے پہچانا جاتا ہے ـــــ یونانی فلسفیوں کے نزدیک زمان لامحدود آنات اور مکان لامحدود نقطوں سے مل کر بنا ہے۔ ان کی نظر میں کائنات سکونی اور حرکت جو بظاہر نظر آتی ہے فریبِ نظر ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کسی محدود وقت میں لامحدود نقطے طے کیے جاسکیں ـــــ اشاعرہ نے یونانیوں کے نظریے کو رد کیا۔ ان کے خیال میں زمان و مکان ایسے نقطوں اور آنوں پر مشتمل ہیں جن کی مزید تقسیم نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے زینو کے اس خیال کی تردید کی کہ حرکت ناممکن ہے دوسرے مسلم مفکرین نے بھی وقت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے یہاں بھی وقت کی ایک قسم کی

اضافی حیثیت ہے۔ مختلف ہستیوں کے لیے جو خالص مادیت سے لے کر خالص روح تک مختلف مدارج رکھتی ہیں، زمان کی نوعیت مختلف ہے۔ مادی اشیاء کے لیے وقت ستاروں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے اور اس کو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غیر مادی ہستیوں کے لیے وقت کا بہاؤ مختلف ہے جو مدت مادی ہستی کے لیے ایک سال کی ہے وہ غیر مادی ہستی کے لیے ایک دن سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح ربّانی یا الٰہی وقت ہے جو گزرنے یا بہاؤ کی خاصیت سے بالکل مبرّا ہے اس میں نہ تقسیم ہے نہ ترتیب ہے نہ تغیر یہ دوام سے بالاتر ہے۔ اس کا نہ آغاز ہے نہ انجام یہی وہ وقت ہے جسے قرآنِ کریم نے ام الکتاب کہا ہے جس میں ساری تاریخ عالم ایک فوق الدوام "اب" میں سما جاتی ہے۔

آئن سٹائن کے نظریہ اضافت میں زمان و مکان مطلق نہیں بلکہ اضافی ہیں علامہ نے زمان و مکان کی اضافی خاصیت کو جاوید نامہ میں یوں بیان کیا ہے۔

از شعور است این کہ گوئی نزد و دور
چیست معراجِ انقلاب اندر شعور
این بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکی مانعِ پرواز نیست

زمان و مکان دونوں اضافی اور حقیقی ہیں لیکن ان دونوں میں زمان زیادہ اساسی ہے۔ ہر شے میں زمان و مکان موجود ہیں لیکن ان کا باہمی تعلق ایسا ہے جیسا جسم اور ذہن کا یعنی زمان مکان کا ذہن ہے۔

علامہ اقبال زمان کو ماہیتِ وجود اور عینِ خودی سمجھتے ہیں لیکن یہ زمان شب و روز کا زمان نہیں بلکہ تخلیقی ارتقا کا نام ہے۔ زمان ان کی نظر میں ایک تخلیقی حرکت ہے گردشِ خورشید سے پیدا ہونے والا زمان مادی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی زنّاری
نہ ہے زمان نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

لیل و نہار کا پابند غلام ہوتا ہے۔ مردِ حُر زمان و مکان سے آزاد ہوتا ہے۔ مردِ حُر زمانہ ساز نہیں ہوتا بلکہ زمانہ سے جنگ کرتا ہے اس کی دنیا ماہ و مہر سے بے نیاز ہوتی ہے[1]

علامہ کی نظر میں ازل سے ابد تک بنی بنائی تقدیر کا تصور بھی زمان کے غلط تصور کی پیداوار ہے ــــــ ان کی نظر میں زندگی زمان میں ایک مسلسل حرکت کا نام ہے ان کے خیال میں انسان اپنے جسم اور روح کے ساتھ مل کر ایک ہی وحدت ہے۔ مادہ بھی روح ہی ہے یعنی روح کو جب ہم زمان و مکان میں بیان کرتے ہیں تو وہ مادہ ہے۔ جدید اضافی نظریے کے مطابق بھی مادہ اور توانائی ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ ان کی نظر میں جس وحدت کو انسان کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ جسم ہے اگر ہم خارجی دنیا میں اس کے افعال پر نظر رکھیں اور روح ہے اور اگر اس کے انجام دادہ کام کی غایت یا نصب العین کا لحاظ رکھیں۔

علامہ کی نظر میں جو شخص زمان کی ماہیت سے آگاہ نہیں وہ حیاتِ جاوداں سے بھی بے خبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی اور زمان دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نئی از حیاتِ جاوداں آگہ نئی
زندگی از دہر است و دہر از زندگی است
"لاتسبوا الدھر" فرمانِ نبیؐ است

(اقبال کا تصورِ زمان و مکان۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی)

مابعد الطبیعیات اقبال۔ ڈاکٹر عشرت حسین

---

[1] علامہ جاوید نامہ میں فرماتے ہیں۔

روز گارش بی نیاز از ماہ و مہر گنجد اندر ساحت او نہ سپہر

غایتہ الامکان فی معرفتہ الزمان والمکان - شیخ تاج الدین محمود
اتقان العرفان فی ماہیت الزمان ۔ سید برکات احمد)

توضیح ۲۸۶ زرتشت نیز دیکھئے توضیح نمبر ۸۷

بقول کرستن سین موحد تھا وہ صرف اہورا مزدا کو خدائے یگانہ مانتا تھا، ۷۷ سال کی عمر میں قتل ہوا۔ قتل کے وقت زرتشت کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ جب قاتل نے زرتشت کو قتل کرنا چاہا تو زرتشت نے اس تسبیح کو توڑ کر جلا دیا۔

علامہ نے زرتشت کو جاوید نامہ میں بہت بلند مقام دیا ہے فلکِ قمر میں گوتم بدھ حضرتِ عیسیٰ اور حضرتِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طواسین کے ساتھ زرتشت کا طاسین ہے جس میں اہرمن اور زرتشت کا مکالمہ ہے۔ جاوید نامہ میں ہر کردار ایک خاص معنویت کا حامل ہے۔ جو عام طور پر اپنے پس منظر میں دو پہلو لیے ہوئے ہے۔ ایک اپنے حالات و واقعاتِ زندگی دوم تعلیمات و افکار۔ ان حالات و واقعات اور تعلیمات و افکار میں سے علامہ نے جو کچھ اپنی اس عظیم نظم میں ہیئت کے تقاضوں اور اپنے نظریۂ حیات سے ہم آہنگ دیکھا اس سے نہایت فنکارانہ مہارت کے ساتھ ایسی ڈرامائی تشکیل کی کہ اس کی شخصیت ایک جیتا جاگتا کردار بن کر اُبھر آئی۔

زرتشت کی زندگی کے حالات و افکار میں سے اہرمن کا زرتشت کو ورغلانا، زرتشت کا واقعہ قتل یا شہادت، علم و عمل کے بارے میں اس کے فرمودات، اس کی تعلیمات میں نور و ظلمت کی آویزش ـــــ یہ ہیں زرتشت کی شخصیت کے وہ نقوش جن سے علامہ نے اس کے کردار میں رنگ بھرا ہے۔

علامہ نے جاوید نامے میں طاسینِ زرتشت کا عنوان "آزمائش کردن اہرمن زرتشت را" کو بنایا خود یہ عنوان اور اس کے تحت اکثر مندرجات اوستا کے حصے ندیداد کے باب انیس سے بہت حد تک مشابہت رکھتے ہیں اس باب میں اہرمن کا زرتشت

گودر غلانے اور اس کی آزمائش کرنے کا ذکر ہے۔ اہرمن زرتشت سے کہتا ہے۔

"ای زرتشتِ مقدس مخلوقِ مزداہ مکن تو پسرِ پوروشسپ ہستی و از مادر زائیدہ شدی (یعنی تو خدا نیستی بلکہ یک انسان ہستی) دینِ خوبِ مزدا پرستی را لعن کن تا نعمتِ دنیا یابی"

مندرجہ بالا اقتباس میں اہرمن کے خیالات کا عکس جاوید نامے کے ان اشعار میں صاف نمایاں ہے۔

؎ زندہ حق از جلوۂ بیضای تست مرگِ من اندر یدِ بیضای تست

؎ لیکن از پیغمبری باید گذشت از چنین ملاگری باید گذشت

دینِ زرتشتی میں نور و ظلمت کی آویزش اور زرتشت کے واقعۂ قتل کے پس منظر میں جاوید نامے کے یہ اشعار ؎

نور دریای است ظلمت ساحلش ہم چو من سیلی نزاد اندر دلش

عشق را در خون تپیدن آبروست آرہ و چوب و رسن عیدین اوست

اور زیادہ گہری معنویت کے حامل بن جاتے ہیں۔

زرتشت کے مندرجہ ذیل دو فرمودات نہ صرف عملی زندگی پر اس کے محکم اعتقاد اور اس کی علم دوستی ہی کے آئینہ دار ہیں بلکہ اس کے معتقدات میں ایمان و عمل کے خوبصورت امتزاج کو بھی پیش کرتے ہیں۔

۱۔ کسی کہ زراعت می کند و در زمین تخم می کارد نیک تر است از او کہ روزانہ ہزار مرتبہ دعا می خواند (جو شخص کھیتی باڑی کرتا ہے اور زمین میں بیج بوتا ہے اس شخص سے ہزار مرتبہ بہتر ہے جو روزانہ ہزار بار درود و دعا پڑھتا ہے)

۲۔ ای عالم راست ترینِ مزدا آفریدۂ مقدس اگر تو در پیش باشی منتظر من بمان اگر در دنبال باشی بمن برس (اے عالم اہورا مزدا کی سب سے اچھی اور مقدس

تخلیق اگر تو سامنے ہے تو میرا انتظار کر اور اگر تو پیچھے ہے تو مجھ تک پہنچ جا)

غالباً زرتشت کی شخصیت کی یہی دلآویزی تھی جس کی بنا پر علامہ نے اسے جاوید نامے میں بہت اہم مقام دیا اور اس کے کردار کے ذریعے اپنے نظریہ حیات کے دو اہم رکن خودی اور عشق کے تصورات کی روح صرف ان دو مصرعوں ہی میں پیش کر دی

۱۔ ع خویشتن را وا نمودن زندگی است

۲۔ ع عشق چو کامل شود آدم گر است

توضیح نمبر ۲۸۷ ۔ ابلیس یا اہرمن ۔ نیز دیکھئے توضیح نمبر ۷۹

علامہ نے جاوید نامہ میں اہرمن یا ابلیس کے بارہ میں چار پانچ مقامات پر اظہار خیال کیا ہے ۔ ایک زرتشت کے ضمن میں دوم حکیم مریخی کے یہاں سوم شاہ ہمدان کے ساتھ اور چہارم حلاّج کے بیان میں —————— حلاّج کے حوالے سے ابلیس کی شخصیت کو پیش کیا ہے جو بہت سنجیدہ اور کم گو ہے لیکن گہری نظر رکھتا ہے ۔ وہ نہایت قسم کا زاہد بھی ہے رند بھی ملاّ بھی اور حکیم بھی ۔ اس نے ساری عمر خیر و شر کی جنگ میں گزار دی ۔ سینکڑوں پیغامبر دیکھے لیکن ابھی تک کافر ہے ۔

کہنہ و کم خندہ اندک سخن چشم او بیننده جان در بدن

رند و ملا و حکیم و خرقه پوش در عمل چون زاہدان سخت کوش

غرق اندر رزم خیر و شر ہنوز صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

جاوید نامہ میں اہرمن یا ابلیس زرتشت کو ترک دنیا کی نصیحت کرتا ہے ۔ حکیم مریخی نے فرزمرز کے عنوان سے ابلیس کا تعارف کرایا ہے فلکِ عطارد میں جمال الدین افغانی کہتے ہیں

کشتنِ ابلیس کاری مشکل است زانکہ اوگم اندر اعماقِ دل است

خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

شاہ ہمدان یوں فرماتے ہیں کہ

بزم با دیو است آدم را وبال　　رزم با دیو است آدم را جمال

علامہ اقبال کی نظر میں بدی یا شر انسانی فطرت کا اک جزو لاینفک ہے۔ ان کی نظر میں ابلیس ایک شخص بھی ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

ع　نوری و نادان نیم سجدہ با آدم برم

در گذشتم از سجود اے بے خبر　　ساز کردم ارغنونِ خیر و شر

لیکن اپنے کفر میں استقامت رکھتا ہے کہ "صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز"

(۲) ابلیس جو "آتش نسب و والا مقام" ہے دون ہمت لوگوں سے بیزار ہے وہ حریف پختہ تر کو پسند کرتا ہے۔

بندۂ صاحب نظر باید مرا　　یک حریفِ پختہ تر باید مرا

(۳) ابلیس دو قسم کے ہیں ایک ناری ایک خاکی۔

(۴) ابلیس علامہ کی نظر میں شر مطلق بھی ہے جو خود وجود انسانی میں موجود ہے۔ یہ ایک محرک طاقت بھی ہے جو انسان کو حرکت و عمل پر اکساتی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا نہ مطلق شر ہے نہ خیر۔ خیر و شر دونوں انسانی زندگی کی ناقابلِ تردید حقیقتیں ہیں۔ نیکی کے فروغ اور زندگی کی ترقی کے لیے شیطان یا شر کا وجود لازمی ہے۔ زندگی بغیر کشمکش اور جدوجہد کے موت ہے۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست

اور یہ جدوجہد شر کے ساتھ ہو تو آدمی کندن بن جاتا ہے۔

خویش را بر اہرمن باید زدن

تو ہمہ تیغ، آن ہمہ سنگ فسن

(شاہ ہمدان)

توضیح ۲۸۸۔ طاسطائی ۔ لیونیکولائی طاسطائی (نیز دیکھئے توضیح نمبر ۸۴)

روس کا مشہور ناول نگار، مفکر اور مصلح ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۱۰ء میں وفات پا گیا۔ طاسطائی تھوڑی عمر میں والدین کے سائے سے محروم ہو گیا۔ ورثے میں بہت بڑی جاگیر ملی۔ کازان یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی بعد میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ جنگِ کریمین میں نہایت بہادری سے لڑا فوج سے ریٹائر ہو کر مغربی یورپ کا سفر کیا اس کے بعد اپنی خاندانی جاگیر میں کھیتی باڑی کرنے لگا اور وہاں کسانوں کے بچوں کے لیے ایک سکول قائم کیا اس کا خیال تھا کہ تعلیم طلبہ کی انفرادی ضرورتوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔

باوجود ایک خوشحال اور کامیاب زندگی کے یہ سوال ہمیشہ اس کے ذہن کو ستاتا رہا کہ زندگی کا مفہوم اور مقصود کیا ہے۔ آخر فلسفے اور مذاہبِ عالم کے وسیع مطالعے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ زندگی کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان خود اپنے اور دوسروں کے لیے باعثِ خیر بنے۔ آخر عمر میں وہ تارک الدنیا اور نباتات خور بن گیا اور عدم تشدد کے نظریے کو اپنا لیا۔ اس کی شخصیت نے برصغیر کے دانشوروں کو بھی متاثر کیا۔ گاندھی نے اس کا عدم تشدد کا نظریہ اپنایا تھا اور یوں گویا گاندھی نے طاسطائی کو اپنا گرو تسلیم کیا تھا۔

علامہ نے اسی لیے اس کو جاوید نامے میں مسیحائی افکار کے نمائندے کے طور پر پیش کیا ہے۔

توضیح ۲۸۹ تقدیر (نیز دیکھئے توضیح نمبر ۱۷۴)

تقدیر کا پراسرار مسئلہ علامہ کے افکار پر چھایا ہوا ہے ان کے خطبات میں بھی اس پر خاصی بحث موجود ہے اور اپنے منظوم کلام میں بھی انہوں نے اس پر اظہارِ خیال کیا ہے وہ ہمیشہ بے حجابی تقدیر کے آرزومند رہے ہیں ؎

گفتند ہر چہ در دلت آید زما بخواہ گفتم کہ بے حجابی تقدیرم آرزوست

علامہ کی نظر میں مسلمانوں میں تقدیر پرستی کے رجحانات پیدا ہونے کے تین اسباب تھے۔ (۱) فلسفیانہ موشگافیاں (۲) سیاسی مصلحتیں (۳) اُس جوش اور جذبۂ حیات کا سرد ہوجانا جو اسلام نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا۔

علامہ کے نزدیک تقدیر پہلے سے مقرر شدہ شے نہیں بلکہ اُن امکانات سے عبارت ہے جو انائے مطلق کے شعور میں موجود ہیں لیکن جنھیں تلاش کرنے اور زندگی میں متشکل کرنے میں انسان کو پورا اختیار حاصل ہے۔ علامہ خطبات میں "خلق کل شئ فقدرہ تقدیرا" کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تقدیر کوئی قوتِ قاہرہ نہیں جو خالق کی طرف سے کسی شے پر بہ جبر عمل کر رہی ہے بلکہ وہ خود شے کی باطنی رسائی ہے اور اس کے وہ قابلِ تخلیق امکانات ہیں جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں مضمر ہیں اور بغیر کسی خارجی جبر کے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ الف

علامہ نے جاوید نامہ میں تقدیر کے مسئلے پر تین بار بحث کی ہے۔ (۱) فلک مریخ میں حکیم مریخی سے (۲) منصور حلاّج سے (۳) حضورِ حق میں اللہ تعالیٰ سے۔

علامہ نے مسئلۂ تقدیر پر متکلمانہ بحث کی بجائے بڑی خوبصورت نکتہ آفرینیاں کی ہیں جو جوشِ عمل سے لبریز ہیں۔ حکیم مریخی کہتا ہے کہ اگر ایک تقدیر تمہیں راس نہیں آئی تو دوسری تقدیر مانگ لو کیونکہ خدا کی تقدیریات لا انتہا ہیں۔ تقدیر کے بارے میں ایک باریک رمز یہ بھی بتایا کہ اگر انسان خود بدل جائے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ تم شبنم ہو گے تو تمہاری تقدیر افتادگی ہے اور قلزم ہو گے تو تمہاری تقدیر پایندگی ہوگی۔

جاوید نامے میں حلاّج نے مسئلہ جبر کے بارے میں ایک خاص نکتہ بتایا کہ جبر، صاحبِ ہمت لوگ اختیار کرتے ہیں جبر سے پختہ انسان اور پختہ ہو جاتا ہے لیکن مردِ ضعیف اور کمزور ارادے کا انسان اگر جبر اختیار کرے تو موت کو دعوت دیتا ہے۔ حلاّج کی نظر میں مردِ مومن کا یہ مقام ہے کہ اس کا عزم، خالقِ تقدیرِ حق ہے میدانِ جنگ میں

الف۔ خطبات (انگریزی) ص ۵۰

اس کا تیر خدا کا تیر ہوتا ہے یعنی مردِ مومن تسلیم و رضا کی اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ گویا خداوند تعالیٰ ہر تقدیر سے پہلے اس سے پوچھتے ہیں کہ تیری رضا کیا ہے۔

حضورِ حق میں علامہ نے تقدیر کے مسئلے پر ایک اور پہلو سے روشنی ڈالی ہے ندائے حق یوں گونجتی ہے کہ زندگی اور تقدیر کی حقیقت تم اس لیے نہیں سمجھ سکتے کہ تم اس جہانِ چار سُو میں گم ہو۔ اس جہانِ چار سو کو اپنے اندر غرق کر لو گے تو یہ حقائق جان سکو گے۔

توضیح ۲۹۰ - بھرتری ہری (نیز دیکھئے توضیح نمبر ۲۴۰)

بھرتری ہری سنسکرت زبان کا بہت عظیم شاعر تھا اس کا زمانہ پہلی صدی قبلِ مسیح ہے وہ اُجین کا بادشاہ تھا۔ ابتدائی زندگی اس نے خوب عیش و عشرت میں گذاری۔ چودہ سال حکومت کرنے کے بعد ایک عجیب واقعہ اس کی زندگی میں رونما ہوا۔ ایک دن ایک برہمن اس کے لیے ایک ایسا پھل لایا جسے کھانے سے انسان ہمیشہ کی زندگی حاصل کر سکتا تھا چونکہ وہ پھل بہت ہی نایاب تھا اس لیے بھرتری ہری نے وہ پھل اپنی پیاری رانی پدماکشی کو دے دیا کیونکہ وہ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس رانی نے خفیہ طور پر وہ پھل لے جا کر اپنے محبوب کو دے دیا جو داروغہ اصطبل تھا اس داروغہ اصطبل نے خفیہ طور پر وہ پھل اپنی محبوب کو دے دیا جو ایک کنیز تھی۔ اس کنیز نے خفیہ طور پر وہ پھل اپنے محبوب کو دے دیا جو خود بھرتری ہری تھا۔ جب راجا کو وہ پھل ملا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اس نے فوراً اس واقعہ کی مکمل تفتیش کرائی یوں سارا راز کھل گیا اور رانی نے شرم کے مارے محل کی چھت سے نیچے گر کر خودکشی کر لی۔ راجا اس واقعہ سے اتنا بددل ہوا کہ حکومت چھوڑ کر جنگل میں نکل گیا۔

بھرتری ہری نے تین قسم کے سو سو قطعات لکھے جنہیں شتک کہا جاتا ہے۔

(۱) شرنگار شتک: اس حصہ میں عشق و محبت سے متعلق مضامین ہیں۔ (۲) نیتی شتک:

اس میں سیاست سے متعلق مضامین ہیں (۳) بیراگیہ شتک: ان قطعات میں معرفت و فقیری کے مضامین ہیں۔

علامہ کا مشہور شعر ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

جو بالِ جبریل کے سرنامے پر ہے۔ بھرتری ہری کے ایک اشلوک یعنی قطعے کا آزاد ترجمہ ہے

جاوید نامے میں علامہ اقبال نے بھرتری ہری کی زبان سے جو کچھ کہلوایا ہے وہ سب کچھ بھرتری ہری کے اشلوکوں سے بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اخذ کیا گیا ہے۔

(اقبال اور بھرتری ہری۔ سید صمد حسین رضوی۔ رسالہ اردو۔ ۱۹۷۷ء شمارہ نمبر ۴)

(شاعرِ اعظم بھرتری ہری۔ مرتبہ انتباہ الدین خان اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

توضیح نمبر ۲۹۱۔ رضا و تسلیم (نیز دیکھئے توضیح نمبر ۲۶۰)

قرآنِ پاک میں ہے رضی اللہ عنہ و رضوا عنہ یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یوں رضا کی دو صورتیں ہیں۔ خدا کا بندے سے راضی ہونا اور بندے کا خدا سے راضی ہونا۔ بقول حضرت علی ہجویری، خدا کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ بندے کی نیکوکاری پر اجر کے طور پر اسے عزت عطا فرمائے اور بندے کا راضی ہونا یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرے۔ مختصر یوں ہے کہ رضا سے مراد ہے کہ بندہ قضائے حق کو بخوشی قبول کرے خواہ عطا ہو خواہ سزا ہو۔

حضرت علی ہجویری نے اہلِ رضا کو چار فرقوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے عطا پر راضی ہیں۔ یہ معرفت ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو نعمتوں پر راضی ہیں۔ یہ دنیا ہے۔ تیسرے وہ لوگ جو مصیبت پر راضی ہیں یہ رنج و محن کا مقام ہے چوتھے وہ لوگ جو برگزیدہ ہونے پر راضی ہیں، یہ محبت ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک درویش دریائے دجلہ میں گر گیا تیرنا نہیں جانتا تھا کنارے پر سے کسی نے پکار کر پوچھا کیا کسی کو مدد کے لیے پکاروں؟ درویش نے کہا نہیں پکارنے والے نے پھر پوچھا، کیا ڈوبنا چاہتے ہو؟ درویش نے پھر کہا نہیں۔ اس نے پوچھا تو پھر کیا چاہتے ہو؟ درویش نے جواب دیا وہی جو خدا چاہتا ہے۔ میرے چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ رضا کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔